منتخب احادیث امام نوویؒ

(اربعین امام نوویؒ)

ترجمہ وتشریح

مولانا امیر الدّین مہر

تعارف

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مُحَمَّدٍ سَیِّدِ الْاَنْبِیَآءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ.

اُمتِ مسلمہ دعوت کی اُمت ہے اس کی بعثت کا مقصد ہی اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا کہ لوگوں کو نیکی کا حکم دے اور بُرائی سے روکے پھر ان میں ایک گروہ لازماً ایسا ہونا چاہیے جو انسانوں کو خیر کی طرف بُلائے' یہ خیر دینِ اسلام اور اس کی جامع تعلیم کا نام ہے۔ چنانچہ دین کے داعیوں نے ہر زمانے میں مختلف طریقوں اور وسیلوں سے دین کی دعوت انسانوں تک پہنچا کر یہ فریضہ ادا کیا۔

ان دُعاۃ وَ ھُداۃ میں ایک گروہ ان علماء کا ہے جنہوں نے اپنے کردار و گفتار کے ساتھ قرطاس وقلم کے ذریعے دعوت کا کام جاری رکھا اور صدقہ جاریہ کے طور بڑ گراں قدر علمی ذخیرہ آنے والی نسلوں کے لیے ورثہ میں چھوڑ گئے' ان قیمتی ذخیروں سے لوگ صدیوں تک استفادہ کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

تحریر کے ذریعے دعوتِ دین کا کام کرنے والوں نے جہاں قرآن مجید کی تشریح وتفسیر عام کرنے کا کام کیا وہاں نبی ﷺ کے افعال و اقوال کی اشاعت پر بھی کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ' ارشاداتِ عالیہ اور آپ کے افعال و اطوار کو جمع کرنے' تشریح و توضیح کرنے' اپنے زمانے کے لوگوں تک پہنچانے اور آنے والی نسلوں تک منتقل کرنے کا حق ادا کر دیا۔

ہدایت کے ان سرچشموں اور روشنی کے میناروں میں سے ایک امام نوویؒ کی اعلیٰ شخصیت ہے۔ امام محی الدین ابوزکریا یحییٰ بن شرف الدین نووی دمشقی رحمتہ اللہ علیہ

واشاعت کا اخلاص ومحبت کے ساتھ ذمہ لیا اور بندوبست کیا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اسے قبول فرمائے قارئین کے لیے نافع بنائے اور
لغزشوں اور فردوگزاشتوں کو اپنے عظیم عفوں سے معاف فرمائے۔ (آمین)

رَبَّنا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّک اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وتُبْ علَیْنا اِنَّک انت التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ.

امیرِ الدین مہر
پروفیسر دعوۃ اکیڈمی
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

حدیث نمبر 1

نیت واخلاص

عَنْ اَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ اَبِیْ حَفْصٍ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَإِنَّمَا لِکُلِّ امْرِئٍ مَانَوٰی، فَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ فَھِجْرَتُہٗ إِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ لِدُنْیَا یُصِیْبُھَا اَوِ امْرَأَۃٍ یَنْکِحُھَا فَھِجْرَتُہٗ إِلٰی مَا ھَاجَرَ اِلَیْہِ." (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت عمر بن خطابؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے فرماتے ہوئے سنا:

''تمام انسانی اعمال کا دارومدار بس نیتوں پر ہے اور آدمی کو اس کی نیت ہی کے مطابق پھل ملتا ہے تو جس شخص نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف ہجرت کی یعنی اللہ اور رسولؐ کی رضاجوئی اور اطاعت کے سوا اس کی ہجرت کا اور کوئی باعث نہیں تھا تو اس کی ہجرت درحقیقت اللہ اور اس کے رسولؐ ہی کی طرف ہوئی اور جو کسی دنیاوی غرض کے لیے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کی خاطر مہاجر بنا تو (اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسولؐ کے لیے نہ ہوگی بلکہ) فی الواقع جس دوسری غرض اور نیت سے اس نے ہجرت اختیار کی تو اللہ کے نزدیک بس اس کی ہجرت مانی جائے گی۔''

تشریح:

یہ حدیث ان احادیث میں سے ایک ہے جو جوامع الکلم ہیں اور جن میں اسلام کی

بنیادی تعلیم دی گئی ہے چونکہ اس میں اخلاصِ نیت کی تعلیم وترغیب ہے اس لیے بہت سے محدثین نے اپنی کتابوں کی ابتدا اس حدیث سے کی ہے تاکہ ان کی نیت اور اخلاص کی صحیح سمت کا تعین ہو جائے۔ اس حدیث کی اہمیت بیان کرتے ہوئے امام شافعیؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ اس میں دین کا ایک تہائی علم آ گیا ہے۔ امام بیہقیؒ اس کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ بندے کے اعمال کا تعلق دل' زبان اور اعضاء سے ہوتا ہے اور نیت (دل کا عمل) ان میں سے ایک ہے۔ امام شافعیؒ سے روایت ہے کہ اس حدیث سے فقہ کے ستر (۷۰) ابواب کا تعلق ہے۔ پھر علماء نے اس کی اہمیت کا ایک پہلو یہ بیان کیا ہے کہ اسلام کے تین بڑے شعبے ہیں: ایمان یعنی اعتقادات' اعمال اور اخلاص چونکہ یہ حدیث اخلاص کے پورے شعبے پر حاوی ہے اس لیے کہا جاتا ہے کہ اسلام کا ایک تہائی حصہ اس میں آ گیا ہے۔

اعمال کے کلمے سے مراد اعمالِ صالحہ ہیں یعنی وہ اعمال جن کے کرنے کا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے حکم دیا ہے جو تقرب الی اللہ اور اجر وثواب کا ذریعہ ہیں۔ ایسے اعمال کی صحت اور قبولیت کا دارومدار نیت واخلاص پر ہے' ایسے اعمال جن میں سرے سے نیت ہی نہیں کی گئی یا نیت کی گئی لیکن وہ اللہ کے لیے نہیں ہے بلکہ کسی دنیاوی غرض ومطلب برآری کے لیے ہے تو ایسے اعمال صحیح نہیں ہوں گے اور نہ ہی ان پر اجر وثواب حاصل ہوگا۔

اللہ تعالیٰ عمل کے ساتھ نیت کا اور ظاہر کے ساتھ باطن کا بھی دیکھنے والا ہے اس کے ہاں ہر عمل کی قدر وقیمت عمل کرنے والے کی نیت کے حساب سے لگائی جائے گی لہٰذا ہر شخص کو کوئی بھی نیک عمل کرتے وقت اپنے دل کو اچھی طرح ٹٹول کر اخلاص کے ساتھ صحیح نیت کر لینی چاہیے۔ معلوم ہو کہ اعمال کی تین قسمیں ہیں:

(۱) طاعات یعنی وہ کام جن کو شریعت نیکی اور ثواب قرار دیتی ہے۔

(۲) معاصی یعنی گناہ ونافرمانی کے کام

(۳) مباحات وہ کام جو فی نفسہ نہ طاعت ہیں اور نہ معصیت جیسے اچھا کھانا اور اچھا پہننا' نیت کی تاثیر طاعات اور مباحات میں ہوتی ہے' معاصی میں نیت کی کوئی تاثیر نہیں ہے اور گناہ ہر صورت میں گناہ ہے چاہے بُری نیت سے ہو یا اچھی نیت سے ہو بلکہ گناہ کے کام کو اچھی نیت سے کرنا اور ثواب کی امید رکھنا مزید قباحت اور سزا میں زیادتی کا باعث ہے۔

نیکی کا بڑے سے بڑا کام بھی اگر اخلاص اور للّٰہیت سے خالی ہوگا تو وہ جہنم ہی میں لے جائے گا۔ قرآن پاک کی ذیل کی دو آیتوں میں صدقات وخیرات کرنے والے دو قسم کے آدمیوں کا ذکر کیا گیا ہے' ایک وہ لوگ جو دنیا کے دکھاوے کے لیے اپنا مال خرچ کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو محض اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کی نیت سے غریبوں' مسکینوں اور حاجت مندوں کی مدد کرتے ہیں۔ ان دونوں گروہوں کے ظاہری عمل میں قطعی یک رنگی ہے اور ظاہر ہے کہ آنکھ ان کے درمیان کسی فرق کا حکم نہیں کرسکتی لیکن قرآن مجید بتلاتا ہے چونکہ ان میں نیتیں مختلف ہیں اس لیے ان دونوں کے عمل کے نتیجے بھی مختلف ہیں۔ ایک کا عمل سراسر برکت ہے اور دوسرے کا عمل بالکل اکارت ہے۔

كَالَّذِىْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ' فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَىْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ. (البقرہ۲:۲۶۴)

''اس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتا تو اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے پتھر کی ایک چٹان ہو' جس پر کچھ مٹی آ گئی ہو اور اس پر کچھ سبزہ اُگ جائے پھر اس پر زوروں کی بارش پڑے جو اس کو بالکل صاف کردے تو ایسے ریاکار لوگ اپنی کمائی کا کچھ بھی پھل نہ لے سکیں گے اور ان منکر لوگوں کو اللہ اپنی ہدایت سے محروم رکھے گا۔''

قرآن اخلاص' اچھی نیت اور اللہ کی رضاجوئی کے لیے مال خرچ کرنے والوں کی مثال اس طرح دیتا ہے:

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ. (البقرہ۲:۲۶۵)

''اور ان لوگوں کی مثال جو اپنے مال محض اللہ کی رضاجوئی کے لیے دل کے پورے ثبات وقرار کے ساتھ خرچ کرتے ہیں' ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے

جیسے کسی سطح مرتفع پر ایک باغ ہو اگر زور کی بارش ہو جائے تو دُگنا پھل لائے اور اگر زور کی بارش نہ بھی ہو تو ہلکی پھوار ہی اس کے لیے کافی ہو جائے۔"

تو اگرچہ ان دونوں نے بظاہر یکساں طور پر اپنا مال غریبوں، مسکینوں اور حاجت مندوں پر خرچ کیا مگر چونکہ ایک کی نیت محض دکھاوے اور ریا کی تھی اس لیے لوگوں کے دیکھ لینے یا زیادہ سے زیادہ ان کی وقتی داد و تحسین اور تعریف کے ڈونگرے برسانے کے سوا اس کو کچھ حاصل نہیں ہوا، کیونکہ اس کی غرض اس انفاق سے اس کے سوا اور کچھ تھی ہی نہیں لیکن دوسرے نے چونکہ اس ایثار اور انفاق سے اللہ کی رضا جوئی اور اس کا فضل و کرم چاہا تھا اس لیے اللہ نے اس کو اس کی نیت کے مطابق پھل دیا۔

اس بات کو حضورِ اکرم ﷺ نے اپنے ایک ارشاد میں اس طرح فرمایا:

"اللہ تعالیٰ تمہاری شکل و صورت اور تمہارے مال نہیں دیکھتا بلکہ وہ تو تمہارے دل (نیتیں) اور تمہارے اعمال دیکھتا ہے۔" (مسلم)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک کسی حسب و نسب، ذات پات اور حسن و جمال کی قدر نہیں ہے بلکہ نیت، اخلاص اور اعمال کی سچائی کی قدر ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

در قیامت ایں نہ پرسندت کہ اجداد تو کیست
لیک آنجا ایں پرسندت کہ اعمال تو چیست

"قیامت کے دن تجھ سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ تیرے باپ دادا کون ہیں؟ بلکہ یہ پوچھا جائے گا کہ تیرے اعمال کیسے ہیں؟"

جس عالم میں ہمیں کام کرنے کا موقع دیا گیا ہے، یہ عالمِ ظاہر اور عالمِ شہادت ہے اور ہمارے حواس و ادراکات بھی یہاں صرف ظاہر اور مظاہر تک محدود ہیں یعنی یہاں ہم ہر شخص کا صرف ظاہری چال چلن دیکھ کر ہی اس کے متعلق اچھی یا بُری رائے قائم کر سکتے ہیں اور اسی بنیاد پر اس کے ساتھ معاملہ کر سکتے ہیں۔ ظاہری اعمال سے اس کی نیتوں، دل کے بھیدوں اور سینوں کے راز دریافت کرنے سے ہم قاصر بھی ہیں اور اس کے مکلّف بھی نہیں ہے اس لیے سیدنا عمر فاروقؓ نے فرمایا:

نحن نحکم بالظاهر واللہ یتولی السرائر (ہمارا کام ظاہر پر حکم لگانا ہے اور مخفی

۔ اللہ کے سپرد ہیں) آخرت میں فیصلہ کرنے والا علام الغیوب ہوگا اور وہاں فیصلہ نیتوں ۔ دل کے ارادوں کے لحاظ سے ہوگا۔ گویا احکام کے بارے میں جس طرح یہاں ظاہری مال اصل ہیں اور کسی کی نیت پر یہاں کوئی فیصلہ نہیں کیا جاتا اسی طرح وہاں معاملہ اس ے برعکس ہوگا اور حق تعالیٰ کا فیصلہ نیتوں پر ہوگا اور ظاہری اعمال کو ان کے تابع رکھا جائے ۔

نیت اور اخلاص کے بارے میں یہ بات ملحوظ رہے کہ کسی عمل کی نیت کرتے وقت اس ں ادائیگی میں اللہ کی رضا کے علاوہ اور کسی پہلو کو سامنے نہ رکھا جائے جیسے کسی آدمی کی شنودی، کوئی مالی، بدنی اور مادی فائدہ، شہرت وغیرہ نہ رکھا جائے اس لیے کہ یہ ایک درجے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک اور ریاء ہے۔ ایک حدیث نبوی ہے:

> ''حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے آ کر رسول ﷺ سے پوچھا کہ ''ایک آدمی جہاد کرتا ہے اور اس سے اجر اور شہرت چاہتا ہے؟'' (کیا یہ صحیح ہے) آپ ﷺ نے فرمایا ''اس کے لیے کچھ نہیں ہے'' اس شخص نے یہ سوال تین مرتبہ دہرایا اور آپ ﷺ ہر مرتبہ یہی فرماتے رہے کہ ''اس کے لیے کوئی اجر وثواب نہیں ہے'' پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ کے ہاں وہی عمل قابلِ قبول ہے جو خالص اللہ کے لیے ہو اور اس سے اس کی رضا طلب کی گئی ہو۔'' (ابوداؤد ونسائی)

ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہے کہ شرک یعنی تھوڑا سا ریاء اور دکھاوا بھی شرک ہے۔

مذکورہ بالا گزارشات سے اور نیت کے بارے میں آمدہ احادیث اور فقہاء کی ضاحتوں سے نیت کے بارے میں چند ایک باتیں خلاصے کے طور پر نکات میں یہاں درج کی جاتی ہیں:

☆ ہر نیک عمل کے لیے نیت کرنی چاہیے اور یہ نیت اس عمل کی ادائیگی میں اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے اور اس کی ادائیگی کے لیے ہو۔

☆ نیت کے الفاظ زبان سے کہنا ضروری نہیں ہیں بلکہ مستحب کے درجے میں ہیں البتہ

دل میں یکسوئی سے ارادہ کرنا ضروری ہے۔

☆ کوئی عمل چاہے کتنا ہی بڑا اور ثواب والا ہو' اللہ تعالیٰ کے ہاں اس وقت شرفِ قبولیت حاصل کرتا ہے جب خاص اللہ کے لیے ہو اور اس میں کسی دوسری بات کی ملاوت نہ ہو' بُرے کاموں میں نیت کو کوئی دخل نہیں ہے' چاہے کتنی اچھی نیت اور ارادے سے کیے جائیں بہر حال بُرے ہی رہیں گے۔

☆ کوئی شخص اپنی نیت کا اظہار کرے تو حتی الوسع اس کی وضاحت اور نیت کو تسلیم کر لیا جائے اور خواہ مخواہ بدگمانی نہ کی جائے۔

نیت کے لفظی معنی ہیں ارادہ کرنا' قصد کرنا۔ شریعت کی اصطلاح میں معنی ہیں کسی فعل کو کرتے وقت دل سے اس کا ارادہ کرنا' نیت کے دوسرے معنی ہیں عبادت کو عادت سے جدا کرنے یا ایک عبادت کو دوسری عبادت سے جدا کرنے کا قصد کیا جائے اگر کسی نے کوئی فعل کرنے کا ارادہ کیا لیکن فعل اس وقت نہیں کیا بلکہ اسے مؤخر کر دیا تو یہ عزم کہلائے گا جیسے کوئی شخص اپنے گھر سے ظہر کی نماز ادا کرنے کے ارادے سے نکلا تو یہ عزم ہے اب یہ شخص نماز کے لیے کھڑا ہو گا تو اس وقت نیت کرے گا۔ شریعت مطہرہ نے کسی عمل کی ادائیگی کے وقت اس لیے نیت رکھی ہے تا کہ آدمی اس کام کے کرنے میں یکسو ہو جائے اور عادت اور عبادت میں فرق واضح ہو جائے۔ علماء نے اس کی مثال یہ دی ہے کہ آدمی مسجد میں بعض اوقات عادۃً ستانے اور آرام کرنے کے لیے جا کر بیٹھ جاتا ہے اب یہ شخص جب اعتکاف کی نیت کر کے بیٹھے گا تو یہ بیٹھنا عبادت بن جائے گا یا جیسے آدمی عموماً عادت کے طور پر غسل کرتا ہے اب یہ جمعہ کے روز سنت سمجھ کر ادائیگی سنت کی نیت سے غسل کرے گا تو یہ عبادت ہو جائے گا اس طرح نیت مقاصد اور عبادات کے درمیان تمیز کرنے کے لیے بھی ہے جیسے ظہر کی چار رکعت سنت اور چار رکعت فرض ادائیگی میں یکساں ہیں' ان میں فرق یہ ہوتا ہے اس معنی کی طرف حضورِ اکرم ﷺ کے اس ارشاد سے رہنمائی ہوتی ہے ''آپ ﷺ سے ایک شخص نے سوال کیا کہ ایک شخص دکھاوے کے لیے لڑتا ہے' ایک حمیت و عصبیت کے لیے لڑتا ہے یا شجاعت کے لیے لڑتا ہے' ان میں سے کون سا اللہ کی راہ میں ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ''جو شخص اس لیے لڑتا ہے تا کہ اللہ کا کلمہ ہی بلند ہو تو یہ اللہ کی راہ میں ہے۔'' (متفق علیہ)

حدیث نمبر 2

دینِ اسلام کی بنیادیں

عَنْ عُـمَـرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ أَیْضًا قَالَ "بَیْنَمَا نَحْنُ جُلُوْسٌ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَـلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ذَاتَ یَوْمٍ اِذْ طَلَعَ عَلَیْنَا رَجُلٌ شَدِیْدُ بَیَاضِ الثِّیَـابِ، شَـدِیْدُ سَوَادِ الشَّعْرِ، لَایُرَی عَلَیْہِ اَثَرُ السَّفَرِ وَلَا یَعْرِفُہُ مِنَّا أَحَدٌ، حَتّٰی جَلَسَ إِلَی النَّبِیِّ ﷺ فَأَسْنَدَ رُکْبَتَیْہِ إِلٰی رُکْبَتَیْہِ وَوَضَعَ کَفَّیْـہِ عَـلٰی فَـخِـذَیْـہِ وَقَـالَ: یَا مُحَمَّدُ أَخْبِرْنِیْ عَنِ الْإِسْلَامِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اَلْإِسْلَامُ اَنْ تَشْھَـدَ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ، وَتُقِیْمَ الصَّلَاۃَ، وَتُؤْتِیَ الزَّکَاۃَ، وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ، وَتَحُجَّ الْبَیْـتَ إِنِ اسْـتَـطَـعْـتَ إِلَیْـہِ سَبِیْلاً، قَـالَ صَـدَقْـتَ، فَعَجِبْنَا لَہُ یَسْأَلُہُ وَیُصَدِّقُہُ، قَالَ: فَأَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِیْمَانِ؟ قَالَ: أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰہِ وَمَلَائِکَتِہٖ وَکُتُبِـہٖ وَرُسُلِـہٖ وَالْیَـوْمِ الْاٰخِـرِ، وَتُـؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ، قَالَ: صَـدَقْـتَ، قَـالَ فَـأَخْـبِـرْنِـیْ عَنِ الْاِحْسَانِ قَالَ: أَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَـرَاہُ، فَـإِنْ لَّـمْ تَـکُـنْ تَرَاہُ فَإِنَّہُ یَرَاکَ، قَالَ: فَأَخْبِرْنِیْ عَنِ السَّاعَۃِ؟ قَـالَ: مَـا الْـمَسْـؤُلُ عَـنْـھَـا بِـأَعْـلَـمَ مِنَ السَّائِلِ، قَالَ: فَأَخْبِرْنِیْ عَنْ اَمَـارَاتِھَـا؟ قَـالَ اَنْ تَـلِـدَ الْأَمَۃُ رَبَّتَھَا، وَأَنْ تَرَی الْحُفَاۃَ الْعُرَاۃَ الْعَالَۃَ رِعَـاءَ الشَّاءِ یَتَطَاوَلُوْنَ فِی الْبُنْیَانِ ثُمَّ انْطَلَقَ، فَلَبِثْتُ مَلِیًّا، ثُمَّ قَالَ: یَا عُـمَـرَ أَتَدْرِیْ مَنِ السَّائِلُ؟ قُلْتُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہُ اَعْلَمُ، قَالَ فَإِنَّہُ جِبْرِیْلُ اَتَاکُمْ یُعَلِّمُکُمْ دِیْنَکُمْ. (رواہ مسلم)

''حضرت عمرؓ یہ بھی روایت کرتے ہیں کہ ایک روز ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ہمارے سامنے ایک شخص آیا اس کے کپڑے بہت زیادہ سفید اور بال بہت زیادہ کالے تھے اس کے حال سے سفر کے آثار ظاہر نہیں ہو رہے تھے اور نہ ہم میں سے کوئی پہچانتا نہیں تھا (وہ چلتے ہوئے مجلس میں آ پہنچا) حتیٰ کہ نبی کریم ﷺ سے اس قدر قریب ہو کر بیٹھا کہ اپنے گھٹنے آنحضرت ﷺ کے گھٹنوں سے ملا دیئے اور اپنی ہتھیلیاں آپ ﷺ کی رانوں پر رکھ دیں پھر اس نے سوال کیا ''اے محمد! ﷺ مجھے بتایئے اسلام کیا ہے؟'' اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''اسلام یہ ہے کہ تم لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی گواہی دو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو اور بیت اللہ کا حج کرو بشرطیکہ وہاں تک پہنچنے کی تمہیں استطاعت ہو۔''

یہ جواب سُن کر اس شخص نے کہا ''صدقت'' (آپ ﷺ نے ٹھیک فرمایا) اس پر ہم لوگوں کو تعجب ہوا کہ وہ سوال بھی کرتا ہے اور پھر ایسے انداز میں ٹھیک بتاتا ہے (جیسے وہ پہلے سے جانتا ہو)

راوی کہتا ہے کہ پھر اس نے پوچھا ''اچھا بتایئے ایمان کیا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا ''ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، آخرت کے دن پر اور اچھی بُری تقدیر پر ایمان لاؤ'' یہ جواب سُن کر اس نے پھر وہی ''صدقت'' (آپ نے ٹھیک فرمایا) کہا۔

پھر اس نے سوال کیا ''اچھا بتایئے احسان کیا ہے؟''

آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی اس طرح عبادت کرو کہ جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو پس اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو۔ (یعنی تمہارے اندر یہ کیفیت پیدا نہیں ہو رہی ہے تو کم از کم یہ سمجھو) کہ بلاشبہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔''

پھر اس نے سوال کیا ''اچھا یہ بتایئے قیامت کب آئے گی؟''

آپ ﷺ نے فرمایا ''سوال کرنے والا اور جس سے سوال کیا گیا ہے، دونوں اس

بارے میں برابر ہیں۔" (نہ مجھے معلوم ہے اور نہ تم واقف ہو)

اس پر اس نے کہا "اچھا تو اس کی نشانیاں بتا دیجیے؟"

آنحضرت ﷺ نے فرمایا "(اس کی بعض نشانیاں یہ ہیں) (لونڈی) عورتیں ایسی لڑکیاں جنیں جو اپنی ماں کی سردار ہوں، تم ننگے پیر، ننگے بدن، قلاش اور بکریاں چرانے والوں کو دیکھو گے کہ اونچی اونچی عمارتیں بنا کر آپس میں اس پر فخر کرنے لگیں۔"

(حضرت عمر کہتے ہیں کہ اس سوال و جواب کے بعد) وہ شخص چلا گیا اور میں بہت دیر تک آپ ﷺ سے سوال کرنے سے رُکا رہا پھر آنحضرت ﷺ نے خود ہی فرمایا "اے عمر! (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کیا تم جانتے ہو یہ سائل کون تھا؟" میں نے عرض کیا "اللہ اور اس کا رسول ؐ ہی خوب جانتے ہیں" آپ ﷺ نے فرمایا "یہ جبرائیل (علیہ السلام) تھے اس غرض سے آئے تھے کہ تمہیں تمہارا دین سکھائیں۔"

تشریح:

یہ حدیث شریف ان احادیث میں سے ایک ہے جن میں اسلام کی بنیادی تعلیم جامع انداز میں بیان کی گئی ہے۔ علماء نے اسلامی تعلیمات کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے: ایک عقائد، دوسرے اعمال اور تیسرے اخبار (یعنی گزشتہ زمانے یا آنے والے دور کی خبریں اور پیش گوئیاں) اس میں ان تینوں باتوں کی تعلیم موجود ہے اس لیے بعض علماء نے اسے "اُم السنۃ" کا نام دیا ہے جیسے سورۃ فاتحہ کا نام "اُم القرآن" رکھا گیا ہے البتہ اس کا مشہور نام "حدیث جبرائیل" ہی ہے کیونکہ حضرت جبرائیل علیہ السلام خود انسانی شکل میں دین سکھانے اور علم پڑھنے اور اس کے آداب بتانے کے لیے آئے تھے۔

(۱) اسلام

اسلام کے اصل معنی ہیں، اپنے آپ کو کسی کے سپرد کر دینا اور بالکل اس کے تابع فرمان ہو جانا اور اللہ کے بھیجے ہوئے اور رسولوں کے لائے ہوئے "دین" کا نام اسلام اس لیے ہے کہ اس میں بندہ اپنے آپ کو بالکل مولا کے سپرد کر دیتا ہے اور اس کی مکمل اطاعت کو اپنی زندگی کا دستور قرار دیتا ہے۔ دینِ اسلام کی اصل حقیقت یہی ہے اور اسی کا مطالبہ ہم

سے کیا گیا ہے۔

فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا. (حج ۲۲: ۳۴)

''تمہارا اللہ وہی الہ واحد ہے لہٰذا تم اس کے ''مسلم'' یعنی مطیع بن جاؤ۔''

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ. (آل عمران ۳: ۸۵)

''جس نے اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرنا چاہا تو وہ ہرگز قبول نہیں ہوگا اور وہ آدمی آخرت میں بڑے گھاٹے والوں میں سے ہوگا۔''

بہرحال اسلام کی اصل روح اور حقیقت یہی ہے کہ بندہ اپنے آپ کو کلی طور پر اللہ کے سپرد کردے اور ہر پہلو سے اس کا مطیع فرمان بن جائے۔

اسلام کے کچھ مخصوص ارکان ہیں جو ایک طرف اسلام کے ''پیکر محسوس'' اور اس کی بنیادیں ہیں اور دوسری طرف وہ تعبدی امور ہیں جن سے اس کیے ہوئے عہد کی تجدید ہوتی رہتی ہے اور ان کے ذریعے ان لوگوں کے درمیان جنہوں نے اپنا دستورِحیاتِ اسلام کو بنایا ہے یعنی مسلمان اور ان کے درمیان جنہوں نے نہیں بنایا، کافی فرق ہوتا رہتا ہے۔

پہلے سوال میں اسلام کے انہی بنیادی ارکان کا تذکرہ کیا گیا ہے یعنی کلمۂ شہادت، نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج بیت اللہ ہیں۔

ارکانِ اسلام اور ایمان کی بنیادی باتوں کو دل وزبان سے تسلیم کر لینے سے ایک شخص دائرۂ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے اور اسے مسلم معاشرے کے تمام حقوق حاصل ہو جاتے ہیں اب اس کے بارے میں شکوک وشبہات کا اظہار کرنا یا اس کی دل کی کیفیت معلوم کرنا اور ٹٹولنا ہماری ذمہ داری نہیں ہے، آخرت کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ ہاں! آخرت میں ایسا اسلام وایمان ہی مطلوب اور نجات کا ذریعہ ہے جس میں اقرار کے ساتھ مکمل دلی تصدیق موجود ہو، آدمی نے ایمان کے تقاضوں کو دل سے تسلیم کیا ہو اور اس کے تقاضوں کے مطابق عمل صالح بھی کیے ہوں۔

شریعت کی اصطلاح میں اسلام اور ایمان دو علیحدہ اصطلاحیں ہیں اور ان دونوں کا

باہمی تعلق بھی ہے لہٰذا انہیں سمجھانے کے لیے منطق کی اصطلاح ہی عموم خصوص من وجہ کا تعلق بتایا گیا ہے یعنی اسلام کا کلمہ عام ہے اور ایمان خاص ہے، یہ دونوں ایک ساتھ تسلیم کرنے کی حد تک شروع ہوتے ہیں پھر عمل کے میدان میں اسلام حاوی رہتا ہے۔

(۲) ایمان

ارکانِ اسلام کا تفصیلی بیان حدیث نمبر۳ میں ملاحظہ کریں، وہاں قدرے تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ یہ عبادتیں انسان کی کس طرح تربیت و تعلیم کرتی ہیں اور ان کا انسانی زندگی اور معاشرے پر کتنا گہرا اثر ہوتا ہے۔

دوسرے سوال میں حضرت جبرائیل علیہ السلام نے ایمان کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے چھ (۶) باتیں گنا کر بتایا کہ ان کو ماننے اور تصدیق کرنے کو ایمان کہتے ہیں، ان چھ (۶) باتوں کا قرآن مجید میں صراحت سے تذکرہ آیا ہے۔ ارشاد ہے:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ. (البقرہ۲:۲۸۵)

”ایمان لایا رسول (ﷺ) اس تعلیم پر جو اس کے رب کی طرف سے اس پر اُتاری گئی ہے اور مومن بھی ایمان لائے۔ یہ سب اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں۔ ہم اس کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور سب نے کہا ہم نے سنا اور اطاعت کی، ہم تیری بخشش چاہتے ہیں اور تیری طرف لوٹنا ہے۔“

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا. (النساء۴:۱۳۶)

”اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی ہے اور اس کتاب پر جو اس نے اس سے پہلے

نازل کی ہے اور جو بھی اللہ، اس کے ملائکہ، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور آخرت کے دن کا انکار (کفر) کرے تو وہ گمراہی میں بہت دُور نکل گیا۔''

پھر تقدیر کے بارے میں دوسری جگہ ارشاد آیا ہے کہ:

''اے پیغمبر! آپ اعلان کر دیجیے کہ ہر چیز خدا کی طرف سے (اور اس کے حکم) سے ہے۔'' (النساء۴:۷۸)

اس سوال کے جواب میں بیان ہونے والی باتوں کو''ایمانِ مفصل'' کہا جاتا ہے جن کی تھوڑی سی تفصیل دی جا رہی ہے:

(الف) اللہ پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے موجود ہونے، وحدہ لاشریک لہ، خالقِ کائنات اور رب العالمین ہونے کا یقین کیا جائے، عیب و نقص کی ہر بات سے پاک اور ہر صفت کمال سے اس کو متصف سمجھا جائے۔

(ب) فرشتوں پر ایمان لانا، ان کو خدا کی پاکیزہ اور محترم مخلوق اور اس کے فرماں بردار بندے مانا جائے۔ نیز یہ مانا جائے کہ ان میں شر، شرارت اور عصیان کا عنصر ہی نہیں ہے اور مخلوقات میں ایک مستقل نوع کی حیثیت سے ان کے وجود کو حق مانا جائے۔

(ج) اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے ذریعے وقتاً فوقتاً اپنی مخلوق کی رہنمائی اور ہدایت کے لیے جو کتابیں نازل کیں ان سب میں آخری کتاب قرآن مجید ہے۔ یہ پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی اور ان کی نگران اور ان کی قائم مقام ہے، ان کتابوں کی ضروری تعلیم قرآن مجید میں سموئی گئی ہے اب قیامت تک کے لیے یہ کتاب ہدایت ہے۔ ارشاد ہے:

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ. (الحجر۱۵:۹)

''بے شک ہم نے ہی قرآن اُتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

(د) اللہ کے رسولوں پر ایمان لانا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وقتاً فوقتاً اور مختلف علاقوں میں اپنے برگزیدہ بندے انسانوں کی ہدایت کے لیے بھیجے ہیں، ان لوگوں نے پوری امانت اور دیانت سے خدا کا پیغام پہنچایا اور لوگوں کو راہِ راست پر لانے کی پوری

پوری کوشش کی اس سلسلے کی آخری کڑی حضرت محمد ﷺ ہیں جو خاتم النبین ہیں اور رہتی دنیا تک کے لیے نبی ہیں۔

(ہ) آخرت پر ایمان یہ ہے کہ اس حقیقت کا یقین کیا جائے کہ یہ دنیا ایک دن قطعی طور پر فنا کر دی جائے گی اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنی خاص قدرت سے پھر سارے مُردوں کو جلائے گا اور یہاں جس نے جیسا کچھ عمل کیا ہوگا اس کے مطابق جزا اور سزا دی جائے گی، آخرت پر ایمان میں مرنے کے بعد جی اُٹھنے، حساب کتاب، پلِ صراط، جنت ودوزخ اور وہ واقعات جن کا ذکر قرآن وحدیث میں قیامت کے دن اور اس کے بعد کے حالات کے سلسلے میں آیا ہے، ان کو حق جاننا اور حق ماننا ہے۔

(و) تقدیر پر ایمان لانا یہ ہے کہ اس بات پر یقین کیا جائے اور مانا جائے کہ دنیا میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے (خواہ وہ خیر ہو یا شر) وہ سب اللہ کے حکم اور اس کی مشیت سے ہے جس کو وہ پہلے سے ہی طے کر چکا ہے، ایسا نہیں ہے کہ وہ تو کچھ اور چاہتا ہو اور دنیا کا یہ کارخانہ اس کی منشاء (اس کے ارادہ) کے خلاف اور اس کی مرضی کے علی الرغم چل رہا ہے۔ایسا ماننے میں خدا کی انتہائی عاجزی اور بے چارگی لازم آئے گی۔

یہ چھ(٦) باتیں ایمان کی بنیادی باتیں ہیں، انہیں دل سے ماننا ایمان باللہ اور ایمان بالرسول کا تقاضا ہے اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ باتیں اسلام کی بنیادی باتوں میں داخل ہیں۔

احسان:

احسان بھی ایک شرعی اصطلاح ہے جس کے خاص مفہوم ومعنی ہیں۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ. (البقرہ۲:۱۱۲)

’’ہاں جس نے اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دیا ہے اس کے ساتھ احسان کا وصف بھی اس میں ہو تو اس کے رب کے پاس اس کے لیے خاص اجر ہے۔‘‘

احسان کے لفظی معنی ہیں کسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، کسی کام کو عمدگی سے سرانجام

دینا اور سچائی سے حکم پورا کرنا لیکن شریعت کی اصطلاح میں اس کا مفہوم وہی ہے جو آپ ﷺ نے بیان فرمایا ہے ''یعنی خدا کی بندگی اس طرح کرنا کہ جیسے خداوند کریم آنکھوں کے سامنے ہے اور گویا ہم اسے دیکھ رہے ہیں'' اس کا دوسرا نام قرآن مجید میں تزکیہ ہے اور علماء کے نزدیک ایک نام تصوف اور فقہ باطنی بھی ہے۔ تزکیہ واحسان کامل مومن بننے اور دنیا وآخرت کی کامیابی کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا احکام کا فقہ یا ظاہری فقہ ضروری ہے جس طرح فقہی احکام معلوم کرنے کے لیے فقیہوں کی ضرورت ہے اس طرح احسان کے لیے بھی مربی ومحسنین کی اور ان کی صحبت اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

علماء نے اس کیفیت کے ساتھ اللہ کی فرماں برداری کرنے کی مثال نوکر کا مالک کے سامنے کام کرنے کی دی ہے جب نوکر اپنے آقا اور مالک کے سامنے کام کر رہا ہوگا تو وہ کام کتنے اچھے طریقے اور دلچسپی سے کرے گا اور اگر نوکر کو یہ پتہ ہو کہ مالک مجھے کہیں سے چھپ کر دیکھ رہا ہے تو بھی کام عمدہ طریقے سے کرے گا لیکن اگر یہ دونوں کیفیتیں نہ ہوں تو کام صحیح نہیں ہوگا' لہٰذا احسان کا عملی زندگی سے گہرا تعلق ہے اور یہ شریعت کا اہم شعبہ ہے۔

حدیث کے اس ٹکڑے کی توضیح بعض حضرات اس طرح کرتے کہ گویا اس کا تعلق نماز سے ہی ہے یعنی نماز اس کیفیت سے ادا کی جائے حالانکہ حدیث کے الفاظ میں کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں ہے پھر تعبد کا جو لفظ آیا ہے، مطلق عبادت وبندگی کے لیے عام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پوری زندگی میں جو انفرادی اور اجتماعی معاملات ہیں، انہیں ادا کرتے وقت شریعت کے احکام کا لحاظ رہنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ کا اس طرح تصور سامنے رہے جیسے حدیث میں بیان ہوا ہے۔

قیامت:

اسلام، ایمان اور احسان کے بارے میں سوالات کے بعد سائل نے قیامت کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

> ''جس سے سوال کیا جا رہا ہے، اسے خود اس بارے میں سائل سے زیادہ علم نہیں ہے۔''

بخاری کی روایت ہے کہ آپ نے اس موقع پر سورۂ لقمان کی آیت ۳۴ تلاوت فرمائی

جس کے ابتدا میں ہی ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰہَ عِنۡدَہٗ عِلۡمُ السَّاعَۃِ (۳۴: سورۃ لقمان) ''قیامت کے وقت کا خاص علم اللہ ہی کے پاس ہے'' اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو اس کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔

قیامت کی نشانیاں:

قیامت کے وقت کے بارے میں مذکورہ جواب پانے کے بعد سائل نے آپ ﷺ سے گزارش کی کہ مجھے اس کی کچھ نشانیاں ہی بتلا دیجیے۔ اس کے جواب میں آپ ﷺ نے دو نشانیاں بیان فرمائیں ایک یہ کہ ''لونڈی اپنی مالکہ کو جنے گی'' دوسری یہ کہ ''نادار، بھوکے اور ننگے لوگ جن کا کام بکریاں چرانا ہوگا، وہ بڑی شان دار عمارتیں بنائیں گے اور ان پر اترائیں گے'' ان جملوں کے کئی مفہوم بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں سے زیادہ راجح یہ ہے کہ قیامت کے قرب میں ماں باپ کی نافرمانی عام ہو جائے گی حتیٰ کہ لڑکیاں جن کی سرشت میں ماؤں کی اطاعت ووفاداری کا عنصر غالب ہوتا ہے اور ماں کے مقابلے میں سرکشی کرنا مشکل ہوتا ہے، وہ بھی نہ صرف ماؤں کے مقابلے میں نافرماں ہو جائیں گی بلکہ اُلٹی ان پر اس طرح حکومت چلائیں گی جس طرح مالکہ اور سیدہ اپنی زر خرید لونڈی پر حکومت کرتی ہے، بلا شبہ یہ نشانی ظاہر ہو چکی ہے۔

دوسری نشانی آپ ﷺ نے جو بیان فرمائی یعنی بھوکے، ننگے لوگ عمارتیں بنوائیں گے اس کا مفہوم یہ ہے کہ قیامت کے قریب زمانے میں دنیوی دھن اور دولت و بالا دستی اور برتری ان نااہل لوگوں کے ہاتھوں میں آ جائے گی جو اس کے اہل نہیں ہوں گے۔ یہ لوگ ملک وملت اور دینِ اسلام کی تبلیغ وخدمت کرنے کے بجائے بڑے بڑے محل بنوائیں گے، اس میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش کریں گے اور ایک دوسرے پر فخر ومباہات جتائیں گے۔ ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

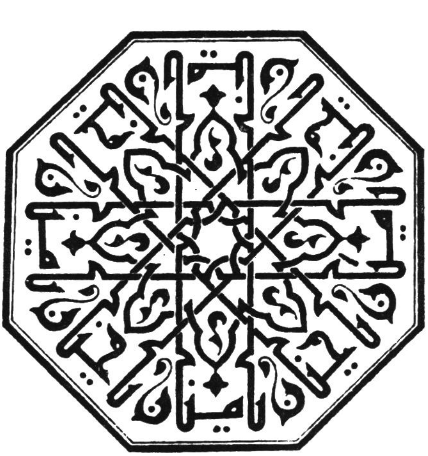
''جب حکومتی اختیارات، مناصب اور معاملات نااہلوں کے حوالے ہونے لگیں تو پھر قیامت کا انتظار کرو۔'' (   )

اس حدیث کی بعض روایات میں تصریح بھی ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی آمد اور یہ گفتگو رسول اللہ ﷺ کی آخری عمر میں ہوئی تھی۔ گویا تئیس (۲۳) سال کی مدت میں

جس دین کی تعلیم مکمل ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ کی رحمت نے چاہا کہ جبرائیل علیہ السلام کے ان سوالات کے جواب میں رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے پورے دین کا خلاصہ اورلب لباب بیان کر کے صحابہؓ کے علم کی تکمیل کر دی جائے اورانہیں امانت کا امین بنا دیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ دین کا حاصل بس چار باتیں ہی ہیں: ایک یہ کہ بندہ مکمل طور پر پوری زندگی میں اللہ تعالیٰ کا مطیع وفرماں بردار بن جائے، اس کا نام اسلام ہے۔ دوم یہ کہ اَن دیکھی غیبی حقیقتوں کو مان کران پر یقین کر لے، یہ ایمان ہے۔ سوم یہ کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا ایسا استحضار حاصل کر لے کہ گویا ہر وقت اس کے حضور میں حاضر ہے اور اس کی فرماں برداری وتعمیل میں لگا ہوا ہے، یہ احسان وتزکیہ ہے اور چہارم یہ ہے کہ قیامت کے حساب کتاب اور جزا وسزا کا خیال ہر وقت اس کے ذہن میں رہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆



حدیث نمبر 3

اسلام کے بنیادی ارکان

عَنْ أَبِیْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُمَا قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ "بُنِیَ الْإِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ شَهَادَةِ أَنْ لَّآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَإِقَامِ الصَّلٰوةِ وَإِیْتَاءِ الزَّکٰوةِ وَحَجِّ الْبَیْتِ وَصَوْمِ رَمَضَانَ. (بخاری ومسلم)

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول ﷺ نے فرمایا ''اسلام کی بنیاد (پانچ باتوں پر رکھی گئی ہے) (۱) گواہی دینا اس بات کی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسولؐ ہیں۔ (۲) نماز قائم کرنا (۳) زکوٰۃ ادا کرنا (۴) بیت اللہ کا حج کرنا اور (۵) رمضان المبارک کے روزے رکھنا۔''

تشریح:

حدیث شریف کو پوری طرح سمجھنے کے لیے اس کے الفاظ پر غور کریں، بنی کا کلمہ بناء سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں: بنیاد رکھنا، تعمیر کرنا، بنانا یعنی اسلام کی بنیاد ان پانچ باتوں پر رکھی گئی ہے۔ سو ان کے ادا کرنے سے اسلام کی تعمیر شروع ہوگی اس کے بعد دوسرے احکام اور باتوں کا کرنا آسان ہوگا اور وہ کارآمد ہوں گی لیکن اگر یہ بنیادی باتیں ترک کر دی جائیں تو اسلام کے دوسرے احکام ادا نہیں ہوں گے اور اگر ادا کیے بھی جائیں تو ان کے پورے اثرات اور ثمرات انسانی زندگی میں ظاہر نہیں ہوں گے۔

سردارِ عالم ﷺ نے فرمایا:

اَلصَّلوٰۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ فَمَنْ اَقَامَھَا فَقَدْ اَقَامَ الدِّیْنَ وَمَنْ تَرَکَھَا فَقَدْ ھَدَمَ الدِّیْنَ. (بیہقی)

''نماز دین کا ستون ہے پس جس نے اسے قائم کیا اس نے دین قائم کیا اور جس نے اسے چھوڑ دیا تو اس نے دین کو گرا دیا۔''

اس سے اندازہ کیجیے کہ ان باتوں کا دین میں کیا مقام ہے اور کتنی بڑی اہمیت ہے اگر یہ موجود ہیں تو دین کے دوسرے اجزاء بھی موجود ہیں اور یہ موجود نہیں ہیں تو دین ضعیف اور کمزور ہے اور دوسرے اجزاء بے وزن ہیں۔

ایمان:

اسلام کی بنیادی باتوں میں سے پہلی بات ایمان ہے، اسلام کے دائرے میں داخل ہونے کے لیے ایمان کی حیثیت اور مقام دروازے کا ہے۔ ایک شخص ایمان کے دروازے سے اسلام کے دائرے میں داخل ہوگا اگر ایمان نہیں ہے تو کسی حالت میں بھی اسلام کے دائرے میں داخل نہیں ہوسکتا اور نہ ہی اس کے اعمال کسی کام کے ہیں، چاہے یہ اعمال کتنے ہی بھاری بھرکم کیوں نہ ہوں اس لیے حضورِ اکرم ﷺ نے اسے سب سے پہلے بیان فرمایا۔

نیز حدیث جبرائیل علیہ السلام میں ایمان کے بارے میں ان کے سوال کرنے پر کہ ''ایمان کیا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا ''تم اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، آخرت کے دن پر اور بھلی اور بری تقدیر پر ایمان لاؤ' لہٰذا کلمہ طیبہ اور کلمۂ شہادت پر ایمان لانے میں ایمانیات کی یہ تمام باتیں شامل ہیں، انہیں ہم عرفِ عام میں ''ایمانِ مفصل'' کہتے ہیں۔ یہ چھ (٦) باتیں ایمان کے اجزاء یا کلمہ طیبہ پڑھنے کے تقاضے اور ضروریات ہیں اس کے بغیر ایمان منعقد اور کارآمد ہی نہیں ہوتا۔ علماء نے کلمہ کو بیج سے نیز تشبیہ دی ہے یعنی جب بیج ہوگا اور صحیح بیج ہوگا تو اسلام کا درخت پیدا ہوگا، بڑھے گا اور پھلے پھولے گا۔

عبادت:

اسلام میں ایمان کے بعد عبادات کا درجہ ہے اور اس میں عبادت کا تصور بہت وسیع

ہے۔ اسلام عبادت کو پوجا پاٹ میں محدود نہیں کرتا اور نہ ہی زندگی کے چند لمحات اور حالات تک محدود کرتا ہے بلکہ اسے پوری زندگی تک پھیلاتا ہے اور انسان کی پوری دنیوی زندگی کو عبادات میں تبدیل کر دیتا ہے، اس کا مطالبہ یہ ہے کہ آدمی کی زندگی کی کوئی گھڑی بھی خدا کی عبادت سے خالی نہ رہے۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار کرنے کے بعد یہ بات لازم آجاتی ہے کہ جس اللہ کو انسان نے اپنا خالق، مالک، آقا اور معبود تسلیم کیا ہے اس کا ہر وقت عبد یعنی بندہ بن کر رہے اس طرح بندہ بن کر رہنے کا نام ہی عبادت ہے۔ اسی کیفیت کو پوری طرح مستحکم کرنے، مکمل بندگی پر قائم رہنے اور اپنے رب سے گہرا تعلق پیدا کرنے کے لیے نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی عبادتیں فرض کی گئی ہیں، ان کے کرنے سے بندہ رب سے قریب تر آئے گا، اس کی روح کو بالیدگی حاصل ہوگی، وہ زمین وآسمان کے مالک کا محبوب وپسندیدہ بندہ بن جائے گا۔ ان چاروں عبادتوں کے سوا اور کوئی ذریعہ ایسا نہیں ہے کہ جس سے یہ مقصد حاصل ہو سکے، اسی بناء پر ان کو ارکانِ اسلام قرار دیا گیا ہے یعنی یہ وہ ستون ہیں جن پر اسلامی زندگی کی عمارت کھڑی ہوتی ہے اور پھر دوسرے اجزاء سے اس عمارت کی تعمیر، تزئین اور آرائش ہوتی ہے۔

بلاشبہ عبادات کی ادائیگی کا اہم مقصد فرض کی تکمیل، رضائے الٰہی کا حصول، آخرت کی نجات وکامیابی اور جنت کا حصول ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اس کی ناراضگی سے بچنا اور آخرت کی خواری سے محفوظ رہنا بھی ہے اس کے ساتھ یہ بنیادی عبادتیں آدمی کو کامل انسان اور معاشرے کا بہترین فرد بنانے میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں، عبادات کو شعور واحساس اور اخلاص واحسان کے ساتھ ادا کرنے سے آدمی انفرادی طور پر ایک بہترین انسان اور اجتماعی زندگی میں مثالی فرد بن جاتا ہے۔

چاروں عبادتوں (نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج) میں جو مصلحتیں اور فائدے مضمر ہیں، وہ بے شمار ولاتعداد ہیں جیسے جیسے انسان کا علم اور عقل ترقی کرتے جائیں گے، ویسے ویسے یہ ظاہر ہوتے جائیں گے۔ کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ان میں صرف یہی حکمتیں اور فائدے ہیں۔ البتہ یہاں ان میں سے چند بیان کیے جاتے ہیں جو ''مشتے نمونہ از خروارے ہیں''، تمام عبادتوں میں کتنی ہی مصلحتیں اور حکمتیں مشترک ہیں اور کتنی ہی باتیں ہر عبادت

میں اس کی خاص ہیئتِ ترکیبی کی حیثیت کی وجہ سے علیحدہ بھی ہیں لہٰذا صرف چند اہم مصلحتیں اور حکمتیں نکات کی صورت میں اختصار سے یہاں بیان کی جارہی ہیں:

☆ عبادتوں کی ادائیگی سے آدمی میں یہ احساس اور شعور اُبھرتا ہے کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اور وہ میرا معبود، رب، آقا اور مالک ہے اس لیے مجھے اسی کے در پر حاضری دینی چاہیے۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

☆ بندے کا براہِ راست اپنے رب سے تعلق قائم ہو جاتا ہے جس سے اس کی ذات وصفات پر ایمان اور یقین حاصل ہو جاتا ہے؟ تقویٰ وتوکل اور صبر وشکر کی صفات نشو ونما پاتی ہیں اور اللہ کی محبت بڑھتی ہے۔

☆ عبادات کی ادائیگی سے اخلاص وعاجزی اور خشوع وخضوع کی اعلیٰ صفات پیدا ہو کر ترقی کرتی ہیں اور انسان نفاق کی بیماری سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

☆ عبادات کے نظام سے نفس کی تربیت ہوتی ہے اور انسان میں اخلاقِ حسنہ پروان چڑھتے ہیں، ایک صف میں کھڑا ہو کر پیر پیر سے ملا کر نماز پڑھنے، ایک وقت پر روزہ رکھنے اور افطار کرنے اور ایک ہی تاریخ اور مقام پر حج کرنے سے مسلمانوں کی آپس میں اُخوت ومحبت اور ہمدردی وغم خواری، مساوات وبرابری کا جذبہ اُبھرتا ہے اور باہمی اپنائیت پیدا ہوتی ہے۔

☆ عبادات کے نظام کی وجہ سے اخلاق سیہٗ کا قلع قمع ہو جاتا ہے جیسے تکبر وغرور، نسلی تفاخر وتدابر، کینہ وحسد اور کدورت وعداوت ختم ہو جاتی ہیں۔

☆ پابندی سے نماز پڑھنے، روزہ رکھنے اور حج کرنے سے ضبطِ نفس کی صفت پیدا ہوتی ہے اور آدمی میں تحمل وبردباری اور صبر وبرداشت کی صفات پروان چڑھتی ہیں۔

☆ عبادات انسان کو وقت کا پابند بناتی ہیں جو شخص باجماعت نماز ادا کرے، مقررہ وقت پر روزے رکھے اور افطار کرے، وہ وقت کا پابند ہوگا اور زندگی کے تمام معاملات میں دوسروں سے کتنا آگے ہوگا۔

☆ زکوٰۃ وصدقات کی ادائیگی، رمضان کے روزے رکھنے، باجماعت نماز ادا کرنے اور حج کرنے سے امیروں، غریبوں اور چھوٹوں بڑوں کے باہمی خوشگوار تعلقات قائم ہوتے ہیں، ایک دوسرے کے لیے خیر سگالی کے جذبات بڑھتے ہیں اور اونچ نیچ کے تصورات ختم ہو جاتے ہیں اور صحیح معنی میں مساوات پیدا ہوتی ہے۔

☆ عبادات کے وسیلے آدمی روحانی وذہنی اور جسمانی طور پر پاک وصاف تندرست وتوانا رہتا ہے اور چستی پیدا ہوتی ہے۔ خاص طور پر روزے سے کتنی ہی ذہنی وجسمانی بیماریاں ختم ہو جاتی ہیں۔

☆ زکوٰۃ وحج کی وجہ سے دولت کی تقسیم ہوتی ہے، کاروبار بڑھتا ہے، دولت گردش میں آتی ہے، غریبوں اور حاجت مندوں کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں اور معاشی خوشحالی کا دور دورہ ہوتا ہے۔ نیز سودی نظام کا خاتمہ زکوٰۃ کے نظام سے ہی ہوسکتا ہے۔

☆ زکوٰۃ وصدقہ کی وجہ سے مال کی محبت دل سے نکل جاتی ہے، بخل وحرص، کنجوسی اور لالچ جیسے بُرے اخلاق کا علاج ہو جاتا ہے۔

☆ حج، عیدین اور جمعات جیسے روح پرور اجتماعات سے مسلمانوں میں اُمت واحدہ کا احساس اُبھرتا ہے، مسلمانوں کے باہمی روابط بڑھتے ہیں اور نسلی، لسانی، طبقاتی اور علاقائی فاصلے مٹ جاتے ہیں۔

☆ ان عبادات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ عبادت گزار کو غریبوں، مسکینوں، بھوکوں، خستہ حالوں، بے گھر اور بے سہارا لوگوں کی تکالیف کا پوری طرح علم ہو جاتا ہے۔ نیز بھوک اور پیاس میں مبتلا ہو کر پنج وقت نماز کے لیے گرمی اور سردی سہہ کر ان کے دُکھوں تکلیفوں کا احساس ہوتا ہے اور وہ معاشرے کے حالات سے باخبر رہتا ہے۔

الغرض اسلام کا نظامِ عبادات مسلمان کو ایک کامل انسان، معاشرے کا بہترین فرد اور ایک بہترین شہری بناتا ہے' ایسا شہری جو وسیع الظرف' جو انسان ذات کا خادم' سب کا ہمدرد وغم خوار، بہی خواہ، وقت کا پابند، میل جول رکھنے والا، اخلاق کا مجسمہ، پاک وصاف جسمانی وروحانی لحاظ سے صحت مند ہوتا ہے۔

یہ ہیں عبادات کے فوائد ومصلحت کے چند پہلو جن کی وجہ سے انہیں دین کی بنیادیں

اور ضروری اجزاء قرار دیا گیا ہے اور انہیں چھوڑنے والوں کے لیے بڑی وعیدیں اور عذاب کی دھمکی دی گئی ہے بلکہ سخت سزا سنائی گئی ہے۔

خداوندکریم ہمیں صحیح معنی میں اپنا عبادت گزار بندہ بنائے اور عبادت کے ثمرات سے نوازے۔ (آمین)

حدیث نمبر 4

انسان کی تخلیق اور تقدیر

عَنْ أَبِیْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَبْدِ اللہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ قَالَ حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللہِ ﷺ وَھُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوْقُ (إِنَّ أَحَدَکُمْ یُجْمَعُ خَلْقُہٗ فِیْ بَطْنِ اُمِّہٖ أَرْبَعِیْنَ یَوْمًا نُطْفَۃً، ثُمَّ یَکُوْنُ عَلَقَۃً مِثْلَ ذٰلِکَ، ثُمَّ یَکُوْنُ مُضْغَۃً مِثْلَ ذٰلِکَ ثُمَّ یُرْسَلُ إِلَیْہِ الْمَلَکُ فَیَنْفُخُ فِیْہِ الرُّوْحَ وَیُؤْمَرُ بِأَرْبَعِ کَلِمَاتٍ: بِکَتْبِ رِزْقِہٖ وَأَجَلِہٖ وَعَمَلِہٖ وَشَقِیٌّ أَوْ سَعِیْدٌ"، فَوَ اللہِ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ غَیْرُہٗ اِنَّ أَحَدَکُمْ لَیَعْمَلُ بِعَمَلِ أَھْلِ الْجَنَّۃِ حَتّٰی مَایَکُوْنَ بَیْنَہٗ وَبَیْنَھَا إِلَّا ذِرَاعٌ، فَیَسْبِقُ عَلَیْہِ الْکِتَابُ فَیَعْمَلُ بِعَمَلِ أَھْلِ النَّارِ فَیَدْخُلُھَا، وَاِنَّ أَحَدَکُمْ لَیَعْمَلُ بِعَمَلِ أَھْلِ النَّارِ حَتّٰی مَا یَکُوْنَ بَیْنَہٗ وَبَیْنَھَا اِلَّا ذِرَاعٌ"، فَیَسْبِقُ عَلَیْہِ الْکِتَابُ فَیَعْمَلُ بِعَمَلِ أَھْلِ الْجَنَّۃِ فَیَدْخُلُھَا. (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے فرمایا (اور آپ ﷺ صادق ومصدوق ہیں)

"تم میں سے ہر ایک کی تخلیق کی تکمیل اس کی ماں کے شکم میں اس طرح ہوتی ہے کہ چالیس (۴۰) دن تک وہ نطفہ رہتا ہے پھر اتنا ہی عرصہ منجمد (جمے ہوئے) خون کا لوتھڑا رہتا ہے پھر اتنے ہی دن گوشت کا ٹکڑا رہتا ہے۔ اس کے بعد اس کی طرف فرشتہ بھیجا جاتا ہے جو اس میں روح پھونک دیتا ہے اور اسے چار باتیں لکھنے کا حکم دیا جاتا ہے یعنی اس کا رزق، اس کی عمر، اس کا عمل

اور اس کے نیک بخت اور بد بخت ہونے کا حکم دیا جاتا ہے۔ پس اس ذات (اللہ) کی قسم جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے کہ تم میں سے کوئی ایک شخص جنتیوں والے عمل کرتا ہے حتیٰ کہ اس کے اور جنت کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو تقدیر کا لکھا اس کے آڑے آ جاتا ہے اور وہ دوزخ والوں کے عمل کرنے لگ جاتا ہے۔ اور اس طرح تم میں سے کوئی ایک شخص دوزخیوں والے عمل کرتا ہے حتیٰ کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ تقدیر کا لکھا اس کے آڑے آ جاتا ہے اور وہ جنت والے عمل کرنے لگتا ہے۔ پس وہ اس میں داخل ہونے کا حق دار ہو جاتا ہے۔"

تشریح:

اس حدیث میں دو اہم باتیں بیان کی گئی ہیں، ایک انسان کی تخلیق اور دوسری تقدیر۔ قرآن میں انسان کی تخلیق کا بیان اس طرح کیا گیا ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ. ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ. (المومنون ۲۳: ۱۴)

"ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی' پھر لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر کھڑا کیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ سب کاری گروں سے اچھا کاری گر۔"

قرآن مجید کے بیان کے مطابق یہ انسان کی انسانی تخلیق کے درجات اور منزلیں ہیں جن سے وہ ایک قطرہ پانی سے لے کر کامل انسان بننے تک گزرتا ہے۔ ان درجات کے درمیان یعنی نطفہ قرار پانے سے ایک سو بیس (۱۲۰) دن بعد اس کی تقدیر لکھی جاتی ہے اور

اسی لکھنے کے مطابق اس کی آئندہ زندگی گزرتی ہے۔ قرآن مجید میں انسان کی پیدائش اور اس کے شکم مادر میں مختلف درجات میں نشوونما پانے کی جو منزلیں اور کیفیتیں بتائی گئیں ہیں، یہ کتاب اللہ کا عملی اعجاز ہے۔ یہ درجات اس وقت بتائے گئے جب ایکسرے، الٹرا ساؤنڈ، خوردبین اور معائنے کا کوئی آلہ ایجاد نہیں ہوا تھا، آج کی جدید دنیا میں ڈاکٹر حضرات، ماہرینِ طب اور اطباء اپنے تجربات اور آلات استعمال کرنے کے بعد بھی ان درجات میں کمی بیشی نہیں کر پائے اور قرآن کے اس بیان پر وہ حیران اور انگشت بہ دنداں ہیں کہ آج سے چودہ سو سال پہلے یہ انکشاف کس طرح کیا گیا ہے اور بعض انصاف پسند اطباء قرآن مجید کی حقانیت تسلیم کر لیتے ہیں۔

انسانی تخلیق، اس کی نشوونما اور اس کے وجود میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت، حکمت، کبریائی اور اس کی بادشاہی کی بڑی نشانیاں ہیں۔ انسان ان میں غور وفکر کرے تو اللہ کی خالقیت، مالکیت، رازقیت اور حاکمیت کا عقیدہ پختہ ہوتا ہے اور وہ اپنی عبدیت، عاجزیت اور بے بسی کو تسلیم کرتا ہے جو اسے اللہ تعالیٰ کی عبادت پر آمادہ کرتی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ. وَفِي أَنفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ.

(الذاریات ۲۰:۲۱)

''اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لیے اور خود تمہارے اپنے وجود میں ہیں کیا تم دیکھتے نہیں؟''

لہٰذا انسان کو اپنی اصلیت اور تخلیقی حقیقت سامنے رکھتے ہوئے تکبر وغرور اور ہٹ دھرمی چھوڑ کر اپنے خالق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا چاہیے اور اللہ کا بندہ بن کر زندگی گزارنی چاہیے۔

تقدیر اسلام کے بنیادی عقیدوں میں سے ایک اہم اور برحق عقیدہ ہے جسے ماننا اور اس پر ایمان لانا ضروری ہے جب تک انسان اس عقیدے کو نہیں مانتا اس وقت تک اسلام وایمان کے دائرے میں داخل نہیں ہو سکتا۔ ایمان مفصل میں ہے:

''یعنی میں اچھی اور بُری تقدیر پر ایمان لایا ہوں۔''

تقدیر کا مسئلہ ایک نازک مسئلہ ہے اور اس کا سمجھنا کسی قدر مشکل بھی ہے لہٰذا مومن کو چاہیے کہ اگر یہ مسئلہ پوری طرح سمجھ نہ پائے تو بحث وحجت نہ کرے بلکہ اپنے دل ودماغ کو اس بات سے مطمئن کرے کہ اللہ کے سچے رسول ﷺ نے اس مسئلے کو اس طرح بیان فرمایا ہے اس لیے میں اس پر ایمان لاتا ہوں۔ چونکہ تقدیر کے مسئلے کا تعلق اللہ تعالیٰ کی صفات سے ہے اس لیے یہ مسئلہ نازک ہونا ہی چاہیے، انسان کا حال تو یہ ہے کہ تا حال اس دنیا کے کتنے ہی معاملات اور کتنے ہی راز وہ سمجھ نہیں سکتا۔ پس جب اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ﷺ نے ایک حقیقت بیان کی ہے سو یہ حقیقت جن لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے تو ایمان لانے کے بعد ایسے لوگوں کے لیے صحیح راستہ یہی ہے کہ اس کے بارے میں کوئی بحث نہ کی جائے اور اپنی عاجزی تسلیم کر لی جائے۔

تقدیر کے لفظی معنی ہیں اندازہ کرنا اور اندازہ لگانا۔ شرع کی اصطلاح میں معنی ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام کائنات اور اس میں موجودات کو پیدا کرنے سے پہلے اس کی تمام کارکردگی، اس کی بقاء اور اس کے انجام کے بارے میں طے کرنا۔ تقدیر کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ جیسے دنیوی زندگی میں ایک دوا ساز کمپنی دوائیاں تیار کرتی ہے تو وہ اس دوا کے بارے میں لکھتی ہے کہ اس دوا کا اتنا وزن استعمال کرنے سے اتنا اثر ہوگا، یہ اثر اتنے وقت چلے گا اور اس مدت کے بعد یہ دوا بے اثر ہو جائے گی۔ اسی طرح ایک پل بناتے وقت ایک انجینئر اس پل کی کارکردگی ،اس میں بوجھ اٹھانے کی سکت اور اس کے باقی رہنے کی مدت بتاتا ہے۔ اسی طرح خالق کائنات جس کا علم بے پایاں ازلی و ابدی ہے ،وہ کائنات کے ایک ایک جز کے بارے میں پورا پورا علم رکھتا ہے اس تمام علم کو ''تقدیر'' کہا جاتا ہے۔

تقدیر کے لکھنے کی نسبت کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے اور کبھی فرشتوں کی طرف۔ جب نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے لکھنے کا مفہوم کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا مطلب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ جس طرح ہم لوگ قلم وکاغذ لے کر کچھ لکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے بھی اسی طرح لکھا ہوگا اس طرح سوچنا اللہ تعالیٰ کی شانِ قدوسی سے ناواقفی ہے۔ دراصل اللہ تبارک وتعالیٰ کے افعال وصفات کی اصلی حقیقت ہماری سمجھ وفہم سے بالاتر ہے' چونکہ ہمارے پاس اس عمل کے لیے کوئی علیحدہ زبان اور لغت نہیں ہے اس لیے لاچار اللہ کی

صفات وافعال بیان کرنے کے لیے وہی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو ہم انسانوں کے کاموں اور صفتوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں ورنہ تو اس کے افعال وصفات کی حقیقت میں اتنا ہی زیادہ فرق ہے جتنا اس کی پاک ذات اور ہم انسانوں کی ذات میں ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بات طے کرنا، مقرر کرنا اور یقین کرنے کو بھی عربی زبان میں کتابت (لکھنا) کہتے ہیں اسی اصول کے پیش نظر قرآن مجید میں روزے فرض کرنے یا مقرر کرنے کے لیے ''کُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ'' قصاص کے حکم کے لیے ''کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ'' فرمایا گیا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تقدیر لکھنے کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے تمام مخلوق کی تقادیر مقرر کردیں اور کائنات میں جو کچھ ہونا ہے، مقرر کردیا اسی معنی کی بناء پر بعض روایات میں کتب کے بجائے قدر کا لفظ بھی آیا ہے۔

تقدیر کی کتابت کے بارے میں حضرت شاہ ولی اللہؒ لکھتے ہیں ''جس طرح ہماری خیال کی کسی قوت'' میں ہزاروں اشیاء کی صورتیں اور ان کے متعلق بہت سی معلومات جمع ہوتی ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ نے عرش کی قوتوں میں سے (ہمارے خیال کی قوت کی طرح) کسی خاص قوت میں تمام مخلوقات اور ان کے حالات وحرکات وغیرہ غرض کہ عالم میں جو کچھ ہونا ہے، وہ ثبت کردیا ہے۔ یعنی دنیا کے پردے پر جو کچھ ہو رہا ہے، وہ سب کچھ عرش کی اس قوت میں اس طرح محفوظ اور موجود ہے جس طرح ہمارے ذہن میں ہزاروں صورتیں اور ان کے متعلق معلومات جمع ہوتی ہے''۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں، تقدیر لکھنے کا مطلب ومفہوم یہی ہے۔

علما نے تقدیر کے متعلق آمدہ آیات واحادیث کو مدنظر رکھتے ہوئے خلاصہ کے طور پر تقدیر کے چار درجات مقرر کیے ہیں، ان درجات کا تعلق اللہ کے بے پایاں علم، کائنات کی تخلیق، لوح محفوظ، انسان کی انفرادی تخلیق اور تقدیر کے عملاً واقع ہونے سے ہے یہ درجات مندرجہ ذیل ہیں:

☆ پہلا درجہ: اللہ تعالیٰ اس کائنات کو وجود بخشنے سے پہلے ہی اس بارے میں سب کچھ اپنے ازلی علم میں جانتا تھا کہ کائنات کا نقشہ کیا ہوگا، اس میں کیا ہوگا، یہ کتنے وقت میں بن کر تیار ہوگی، کتنا وقت چلے گی اور اس میں کون سے واقعات ظہور پذیر ہوں

گے۔

مطلب یہ ہے آگے چل کر وجود پذیر ہونے والے عام کے متعلق جو تفصیل اور جو ترتیب اس کے ازلی علم میں تھی ان کے بارے میں ازل میں طے کر دیا تھا کہ یہ سب کچھ وجود میں لایا جائے گا اس طے فرمانے (خدائی فیصلے) کو تقدیر کا پہلا مرحلہ اوّل ظہور کہا جاتا ہے۔

- دوسرا درجہ لوحِ محفوظ کا ہے جس میں مخلوقات کی تقدیریں اجمالی طور پر لکھی ہوئی ہوتی ہیں اسی تقدیر کو علماء نے ''تقدیر معلق'' بھی کہا ہے یعنی اس میں دعا اور بعض دوسرے ذرائع سے تبدیلی ہوسکتی ہے۔ارشادِ ربانی ہے:

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ. (الرعد۱۳:۳۹)

''جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے جو چاہے ثابت رکھتا ہے اور اس کے پاس اُم الکتاب ہے۔''

شاہ ولی اللہؒ کے بقول یہ وہ کیفیت ہے کہ عرش کی قوتِ خیالیہ میں تمام مخلوقات کی تفصیلی تقدیر کا عکس پیدا کیا گیا اور عرش اس تقدیر کا حامل بن گیا۔

- تیسرا درجہ وہ ہے جسے فرشتہ ماں کے پیٹ میں نطفہ قرار پانے کے بعد ایک سو بیس (۱۲۰) دن گزرنے پر لکھتا ہے جس کا بیان اس حدیث کے مطالعہ میں آیا ہے اس میں عمر، عمل، رزق، سعادت وشقاوت درج ہوتے ہیں اور یہ تقدیر کا تیسرا ظہور ہے۔
- چوتھا درجہ اس تقدیر کا واقع ہونا اور عمل میں آنا ہے جسے ہم اپنی عملی زندگی میں دیکھتے ہیں کہ تمام اسباب ووسائل جو ہم نے بنائے ہوئے ہوتے ہیں، ان کے باوجود ایک کام اس منصوبے اور تدبیر کے اُلٹ ہو جاتا ہے۔ یہ تقدیر کا چوتھا درجہ اور چوتھا ظہور ہے۔

اس حدیث میں ایک حقیقت یہ بھی بتائی گئی ہے کہ کسی شخص کو اچھے یا بُرے عمل کرتے دیکھ کر اس کے انجام اور نتیجے پر حتمی اور یقینی فیصلہ نہ کیا جائے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ آخر میں رستہ بدل لے اور دوسری طرف چلا جائے اسی لیے کہا گیا ہے کہ اعمال کا انجام خاتمے پر ہے،اس طرح یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کو مایوس ہو کر نہ بیٹھنا چاہیے بلکہ نیکی کی طرف ہر وقت توجہ

اور دھیان رکھنا چاہئے اور نیکی کرتے ہوئے بھی اس پر قائم رہنے اور ثابت قدمی اور اچھے انجام کی دعا کرنی چاہئے۔

تقدیر اللہ تعالیٰ کی قدرت کا مظہر ہے اور اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی صفات سے ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو پوری طرح سمجھنا مشکل کام ہے اس لیے اس کے بارے میں جو کچھ قرآن وحدیث میں آیا ہے اس پر ایمان لانا چاہیے اور زیادہ بحث ومباحثہ نہ کرنا چاہیے۔

تقدیر کے لکھے کا علم کسی کو بھی نہیں ہے، اس لئے آدمی شریعت کے احکام پر عمل کرتا رہے اور دنیاوی معاملات کے انجام دینے میں تدبیر اختیار کرے۔اسلام تدبیر اختیار کرنے میں کوتاہی کرنے کی اجازت نہیں دیتا، جب تدبیر کے مطابق نتیجہ نہ نکلے تو پھر کہا جا سکتا ہے تقدیر (قسمت) میں لکھا ہوا نہیں تھا اس لئے یہ کام نہیں ہوا۔

تقدیر پر ایمان رکھنے سے زندگی زیادہ آسان اور سہل گزرتی ہے، دنیاوی زندگی میں اُتار چڑھاؤ آنے سے افسوس اور دکھ نہیں ہوتا بلکہ تقدیر پر ایمان کی وجہ سے صبر آ جاتا ہے۔

اس لیے یہ مذموم (ناپسندیدہ) ہی ہوگی۔''

دینی نقطۂ نگاہ سے بدعت ایسی بات، عمل اور کام کو کہا جاتا ہے جو دین سمجھ کر ادا کیے جائیں البتہ جو کام دین سمجھ کر ادا نہ کیے جائیں تو وہ بدعت کے حکم میں نہیں ہیں جیسے ریل اور بس کی سواری کرنا، بوٹ پہننا، لاؤڈ سپیکر یا دوسری بجلی کی چیزیں استعمال کرنا۔ مطلب جو چیزیں اور باتیں دین کے اصول اور فروغ کے خلاف نہیں اور انہیں دین سمجھ کر استعمال نہ کیا جائے تو یہ بدعت نہیں۔ بدعت یہ ہے کہ کوئی ایسا کام اور طریقہ جو دین کے اصولوں اور فروعوں کے مطابق نہیں ہے، اسے دین میں شامل کرنا اور دینی اعمال کی طرح لازم کر لینا بدعت ہے جیسے شادی اور غمی کے موقعوں پر اور دوسرے مؤاقع پر کتنی ہی چھوٹی بڑی ایسی باتیں ہیں جنہیں دین سمجھ کر ادا کیا جاتا ہے جیسے تیجا، بارہواں، چالیسواں، قبروں پر کھانے کی اشیاء، اناج اور مٹھائیاں تقسیم کرنا، قبروں پر اذان دینا، صلوٰۃ وسلام کے وقت کھڑا ہونے کو لازم سمجھنا، امام جعفر کے کونڈے اور قبروں پر چراغ جلانا وغیرہ۔

شریعتِ مطہرہ میں بدعت کی اتنی سخت مذمت وممانعت کیوں کی گئی ہے؟ عالم اور مبلغ حضرات اتنی سختی سے کیوں اس سے روکتے ہیں اس کے متعدد اسباب ہیں، چند ایک کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

(الف) قرآن مجید میں ارشاد ہے:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا. (المائدہ ۵:۳)

''آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت (شریعت) پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین کے طور پر پسند کیا۔''

اب اگر کوئی شخص دین میں کوئی نئی بات شامل کرتا ہے تو گویا کہ وہ اپنے عقیدے اور عمل سے ظاہر کر رہا ہے کہ دین نامکمل اور ناقص ہے اور وہ اس کی تکمیل کر رہا ہے اس طرح یہ اس بیان کردہ آیت کو تسلیم نہیں کر رہا ہے۔

(ب) بدعت اختیار کرنے سے حضور ﷺ کی عطا کردہ شریعت پر بھی حرف لازم آتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

لَقَدْ تَرَكْتُكُمْ عَلٰى مِثْلِ الْبَيْضَاءِ لَيْلُهَا كَنَهَارِهَا لَا يَزِيغُ عَنْهَا اِلَّا هَالِكٌ''۔

''میں نے تمہیں ایسی روشن اور واضح راہ پر چھوڑا ہے جس کے دن اور رات یکساں نمایاں ہیں اس سے وہی ہٹے گا جو ہلاک ہونے والا ہوگا۔''

مطلب یہ کہ آپ ﷺ واضح اور صاف شریعت دے کر گئے ہیں اب اگر کوئی شخص میں کمی وبیشی کرتا ہے تو گویا اپنے خیال وعمل سے یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ ﷺ نے ں اور غیر واضح شریعت عطا کی ہے اس عمل سے وہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔

) بدعت ایجاد کر کے یا دین میں کسی غیر اہم کو اہم قرار دے کر یا شریعت نے کسی کام کو کسی وقت اور پیمانے کے ساتھ متعین نہیں کیا ہے اس کو وقت اور پیمانے کے ساتھ متعین کر کے وہ گویا حضور ﷺ کے بارے میں یہ تصور دے رہا ہے کہ آپ ﷺ نے شریعت پہنچانے میں کوتاہی وکمی کی ہے۔ امام مالکؒ نے فرمایا:

مَنْ اَتٰى بِدْعَةً فَقَدْ ظَنَّ اَنَّ مُحَمَّدًا ﷺ اَخْطَأَ الرِّسَالَةَ.

''جس نے کوئی بدعت کا کام کیا اس نے یہ سمجھا ہے کہ محمد ﷺ نے اللہ کا پیغام پہنچانے میں کوتاہی کی ہے۔''

معاذ اللہ بدعت کا یہ کتنا خطرناک پہلو ہے۔

بدعت کی بات اور کام چونکہ شریعت میں نہیں ہوتا اس لیے اس کی ابتدا اور ایجاد سے اُمت میں اختلاف اور تفرقہ پیدا ہوتا ہے جس سے اُمت فرقوں، گروہوں اور مسلکوں میں بٹ جاتی ہے۔ لوگوں میں مناظرے، فرقہ بندیاں اور گروہ بازیاں زور پکڑ جاتی ہیں اور اُمت کا اتحاد اتفاق اور یکجہتی ختم ہو جاتی ہے۔ شریعت کی روح اعتدال اور میانہ روی اور ہر حکم کو اپنے مقام اور مرتبے پر رکھنا ہے لیکن بدعت پیدا ہونے اور رواج پانے کے بعد غلو اور شدت آ جاتی ہے جیسے حضورِ اکرم ﷺ کا اذان واقامت میں نام آنے پر انگوٹھا چومنا۔ بعض حضرات کے ہاں زیادہ سے زیادہ استحبابی فعل یا مباح ومتبرک ہے جب کہ دوسروں کے ہاں اس کا ثواب اور تعین کرنا غیر اولیٰ ہے لیکن اس کے قائل اس پر اتنا زور دیتے ہیں جتنا فرض واجب اور سنتِ مؤکدہ پر دیا

جاتا ہے اور اس کے ترک کرنے پر ہرگز تیار نہیں ہوتے بلکہ لڑنے پر تیار ہو جا۔
ہیں جبکہ دوسری طرف اس کی تردید کرنے والے بھی اتنی ہی شدت اختیار کرتے ہیں
اور اس پر بحث ومباحثہ کر کے لوگوں کو شکوک وشبہات میں مبتلا کرتے ہیں۔ یہ۔
دین میں غلو وشدت اور اس کے نتیجے میں ہونے والی فرقہ بازی اور فرقہ بندی۔

(ھ) بدعت کا ایک نقصان یہ ہے کہ اُمت میں جتنی بدعتیں زور پکڑتی جائیں گی، اتنی سنتیں
کم ہو کر اُٹھتی جائیں گی۔ حضرت غفیف بن حارث الثمالی روایت کرتے ہیں:

قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَـا اَحْدَثَ قَوْمٌ بِـدْعَةً اِلَّا رُفِعَ مِثْلُهَا مِنَ السُّنَّةِ فَتَمَسُّکٌ بِسُنَّةٍ خَیْرٌ مِنْ اِحْدَاثِ بِدْعَةٍ. (مسند احمد ومشکوٰۃ)

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو قوم بھی کوئی بدعت ایجاد کرے گی تو اس کے بقدر سنت اس سے اُٹھالی جائے گی۔ پس بدعت ایجاد کرنے کی بہ نسبت سنت سے چمٹ جانا بہتر ہے۔''

(و) بدعت اختیار کرنے والوں کو توبہ کی توفیق نصیب نہیں ہوتی کیونکہ بدعت اختیار کر۔
والا یہ کام دین سمجھ کر ثواب کے لیے ادا کرتا ہے اور مسئلے کی وضاحت والوں ۔
بھدے رویے اور طرزِ عمل کی وجہ سے اس پر ضد کر کے جم کر کھڑا ہو جاتا ہے اور اس
کی صحیح حقیقت اور کیفیت معلوم نہیں کرتا جس کی وجہ سے عمل سے رجوع کرنے
چھوڑنے اور توبہ کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔

''الترغیب والترہیب'' میں ہے کہ ''شیطان نے کہا کہ میں نے لوگوں سے گناہ کر
کے انہیں ہلاک کیا (اور دوزخ کا حق دار بنا دیا) تو انہوں نے مجھے اس طرح شکست دی کر
گناہ کر کے توبہ کر لی (اور میری محنت ضائع کر دی) پھر جب میں نے یہ طریقہ دیکھا تو اس
میں ایسے اعمال رائج کیے جو نفس کے موافق ہیں (یعنی حقیقت میں گناہ ہیں لیکن چونکہ وہ گنا
نہیں سمجھتے) اس لیے اپنے آپ کو ہدایت پر سمجھتے ہوئے توبہ واستغفار نہیں کرتے۔''

بدعت کو روکنے کا کام علمائے کرام اچھے طریقے سے کر سکتے ہیں، یہ حضرات انہیں
روکنا چاہیں تو روک سکتے ہیں لیکن کتنے ہی اہلِ علم ان میں سے ان کاموں (بدعتوں) میں
شریک ہو کر ان کی ہمت افزائی کرتے رہتے ہیں اس کا سبب شاید عوام سے مرعوبیت، ذاتی

ملحتیں اور مفاد اور دنیاوی غرضیں ہوتی ہیں جس کی وجہ سے عوام کے ساتھ شریک رہتے ں۔

بہرحال ایک مومن کے نقطہ نگاہ سے دین کے ایسے امور اور کاموں میں جو علماء کے رمیان اختلافی ہیں، ان کے بارے میں مسلک جذبات اور لگاؤ سے بالاتر ہوکر کشادہ دلی ر وسعت ظرفی سے کام لے کر اچھی طرح تحقیق کر کے، دین میں ان کا مقام ومرتبہ اور میت معلوم اور متعین کیا جائے پھر ان پر اسی حیثیت اور درجے کے مطابق عمل کیا جائے اور ند، عناد اور گروہی اور مسلکی عصبیت میں مبتلا نہ ہونا چاہیے اور ہر کام اللہ اور اس کے رسولؐ کے واضح احکام کو پیش نظر رکھ کر کرنا چاہیے اور اللہ کی رضا ہی پیش نظر ہونی چاہیے۔

حدیث نمبر 6

شک وشبہ کی چیزوں سے پرہیز

عَنْ أَبِی عَبْدِ اللہِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِیْرٍ رَضِیَ اللہُ عَنْهُمَا قَالَ : سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللہِ ﷺ یَقُوْلُ : اِنَّ الْحَلَالَ بَیِّنٌ وَإِنَّ الْحَرَامَ بَیِّنٌ، وَبَیْنَهُمَا أُمُوْرٌ مُشْتَبِهَاتٌ لَا یَعْلَمُهُنَّ کَثِیْرٌ مِنَ النَّاسِ، فَمَنِ اتَّقَی الشُّبُهَاتِ، فَقَدِ اسْتَبْرَأَ لِدِیْنِهٖ وَعِرْضِهٖ، وَمَنْ وَقَعَ فِی الشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِی الْحَرَامِ کَالرَّاعِیْ یَرْعٰی حَوْلَ الْحِمٰی یُوْشِکُ أَنْ یَقَعَ فِیْهِ، أَلَا وَاِنَّ لِکُلِّ مَلِکٍ حِمًی، اَلَا وَاِنَّ حِمَی اللہِ مَحَارِمُهٗ اَلَا وَاِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ أَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ. (البخاری ومسلم)

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے فرماتے سنا:

''حلال واضح ہے اور حرام واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان بعض مشوک وشبہات والی چیزیں ہیں جنہیں بہت سے لوگ نہیں جانتے سو جو شخص شبہات سے بچا اس نے اپنے دین اور آبرو کو بچالیا اور جو شخص شبہات میں مبتلا ہو گیا (یعنی شبہات والی باتوں پر عمل کیا) وہ حرام میں مبتلا ہو جائے گا جیسے چرواہا اپنے ریوڑ کو ممنوع چراگاہ کے قریب چرائے گا تو ہوسکتا ہے کہ اس کا ریوڑ اس میں چرنے لگے۔ سنو ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہوتی ہے اور سنو اللہ کی چراگاہ اس کی حرام کردہ (ممنوع) چیزیں ہیں۔''

پھر آپ نے فرمایا:

''سنو! انسان کے بدن میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے جب وہ درست ہو جائے تو سارا بدن درست ہو جاتا ہے اور جب وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ سنو! وہ ٹکڑا دل ہے۔'' (بخاری و مسلم)

تشریح:

قرآن مجید اور احادیث شریف میں بہت سی چیزوں کو حلال اور بہت ساری اشیاء کو حرام قرار دیا گیا ہے لیکن چونکہ ہر شخص کو پورے قرآن و حدیث کا علم نہیں ہے، پھر علم ہوتے ہوئے بھی کسی خاص معاملہ کے متعلق قرآن و حدیث سے حل نکالنا ہر شخص کا بلکہ ہر عالم کا بھی کام نہیں ہے اس لیے زندگی میں بہت سے واقعات و معاملات ایسے پیش آتے ہیں کہ انسان چیزوں کے حلال یا حرام ہونے کا فیصلہ کرنے سے عاجز ہو جاتا ہے اور شبہ میں پڑ جاتا ہے یعنی ایسی اشیاء اور ایسے امور جن کی حلت و حرمت قرآن و حدیث سے واضح نہ ہو یا ایسے معاملات جن کے بارے میں یہ شبہ واقع ہو کہ یہ جائز ہے یا ناجائز ہے تو ایسی حالت میں اسے چھوڑ کر ایسے پہلو پر عمل کیا جائے جس میں شک و شبہ نہ رہے۔ آپ ﷺ نے ایسے امور سے بچنے کے لیے شاہی چراگاہ کی مثال دے کر سمجھایا کہ چراگاہ سے اپنے ریوڑ کو دور رکھے کیونکہ چراگاہ کے قریب ہونے پر ڈر ہے کہ اچانک ریوڑ چراگاہ کی مقررہ حد عبور کر کے اس میں داخل ہو جائے اور سزا کا مستحق بن جائے اس لیے امن و سلامتی اس میں ہے کہ آدمی گناہ کی حد کے قریب ہی نہ جائے۔ ایک حدیث میں مشتبہ چیز سے بچنے کی اس طرح مثال ملتی ہے:

عدی بن حاتم نے عرض کیا ''یا رسول اللہ! ﷺ میں شکار کے وقت اپنے کتے کو بسم اللہ پڑھ کر شکار پر چھوڑتا ہوں پھر شکار پکڑنے کے وقت اس کے ساتھ ایک دوسرا کتا بھی پاتا ہوں'' اس پر آپ ﷺ نے فرمایا ''(تم اسے نہ کھاؤ کیونکہ تم نے اپنے کتے پر بسم اللہ پڑھی تھی اور اس دوسرے پر نہیں پڑھی تھی)'' ایسے معاملے اور کام میں جو کہ پوری طرح واضح نہیں ہے بلکہ مشتبہ ہے اور اس میں دونوں پہلو یکساں ہیں، اس میں احتیاط اور تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ اسے نہ کھایا جائے۔ ایک حدیث میں ایسے موقع پر آپ ﷺ نے ایک اور اصول بیان فرمایا ہے۔

دَعۡ مَا یُرِیۡبُکَ اِلٰی مَا لَا یُرِیۡبُکَ

''اس چیز کو چھوڑ دو جو تمہیں شک میں ڈالتی ہے اور وہ بات اور پہلو اختیار کر لو جو تمہیں شک میں نہ ڈالے بلکہ یقین کی حد پر پہنچا دے۔''

اسی طرح کی ایک اور روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو خود اپنے گھر میں ایک کھجور پڑی ہوئی ملی، اسے دیکھ کر فرمایا کہ اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ شاید یہ صدقہ کی ہو تو میں اسے کھا لیتا۔ (الترغیب والترہیب) اس کھجور کے متعلق آپ ﷺ کو شک ہوا کہ صدقہ کی ہے یا غیرِ صدقہ (ہدیہ وغیرہ) کی ہے چونکہ صدقہ کی چیز کا آپ ﷺ کے لیے کھانا منع تھا اور غیرِ صدقہ کی جائز تھی اس لیے آپ ﷺ نے نہ کھانے کو ترجیح دی اور شبہ سے پرہیز فرمایا اس طرح اُمت کو بھی چاہیے کہ شبہات وشکوک کے معاملے میں رسول اللہ ﷺ کے قول وفعل پر عمل کرے۔

حضور ﷺ نے دین وآبرو کی حفاظت کے لیے جو باتیں ضروری قرار دی ہیں، ان میں سے ایک شکوک وشبہات سے اور شکوک وشبہات پیدا کرنے والی باتوں سے بچنے کی ہدایت فرمائی۔ دین کی حفاظت کا مختصر تذکرہ اوپر بیان ہوا ہے البتہ عزت وآبرو کی حفاظت کے لیے بھی ضروری ہے کہ آدمی شبہات اور تہمت و بدگمانی والی باتوں اور چیزوں سے دُور رہے کیونکہ شبہات وشک والی باتوں پر عمل کرنے سے عام لوگ اس کی غیبت کریں گے اور گناہ میں مبتلا قرار دے کر پروپیگنڈہ کریں گے یا اس مسئلے کی حقیقت نہ سمجھنے کی وجہ سے وہ خود اس مسئلے کے حرام کی پہلو میں مبتلا ہو جائیں گے اس لیے آپ ﷺ کے اس ارشاد کو سامنے رکھنا چاہیے:

مَنۡ کَانَ یُؤۡمِنُ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ فَلَا یَقۡفَنۡ مَوَاقِعَ التُّھَمِ۔

''جو شخص اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ تہمتوں اور بدگمانیوں کے موقعوں سے دُور رہے۔''

اس طرح آپ ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا:

اِیَّاکَ وَمَا یَسۡبَقُ اِلَی الۡقُلُوۡبِ اِنۡکَارُہٗ وَاِنۡ کَانَ عِنۡدَکَ اِعۡتِذَارُہٗ فَرُبَّ سَامِعٍ نکرا لا تَسۡطِیۡعَ اِنۡ تُسۡمِعَہٗ عُذۡرًا۔

''اپنے آپ کو ان باتوں سے دُور رکھو جن سے لوگوں کے دلوں میں کراہیت ہو اگرچہ آپ کے پاس اس کے کرنے کا عذر موجود ہے کیونکہ بہت سے ایسے سننے والے جوان کے بارے میں کراہیت رکھتے ہیں، آپ انہیں اپنا عذر نہیں سنا سکیں گے۔''

یعنی ہر شخص تک اپنا عذر اور اپنی برأت آپ کے لیے پہنچانا مشکل کام ہے اس لیے سرے سے اس کام ہی سے دُور رہیں تاکہ لوگوں کے دلوں میں آپ کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا نہ ہوں اور آپ کا احترام وعزت باقی رہے۔

اسی طرح ترمذی میں آپ ﷺ کا ایک ارشاد ہے:

اِذَا اَحْدَثَ اَحَدُکُمْ فِی الصَّلاۃِ فَلْیَأْخُذْ بِاَنْفِہٖ ثُمَّ لِیَنْصَرِفْ.

''جب تم میں سے کسی کا نماز میں وضوٹوٹ جائے تو اسے چاہیے کہ اپنی ناک پکڑ کر باہر آئے۔''

تاکہ لوگوں میں یہ چہ میگوئی نہ ہو کہ اس کا وضوٹوٹ گیا ہے۔ یہ تمام حدیثیں اور زیر مطالعہ حدیث ملا کر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ مومن کو اپنے دین اور آبرو کی بڑے احتیاط سے حفاظت کرنی چاہیے اور کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہیے جس کی وجہ سے دین میں نقص پیدا ہو یا عزت وآبرو پر حرف آئے۔

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

لَعَنَ اللّٰہُ السَّارِقَ یَسْرِقُ الْبَیْضَۃَ فَتُقْطَعُ یَدُہٗ وَیَسْرِقُ الْحَبْلَ فَتُقْطَعُ یَدُہٗ. (متفق علیہ)

''اللہ تعالیٰ لعنت کرے اس چور پر جو ایک انڈہ چراتا ہے پھر اس کا ہاتھ کاٹا جائے اور ایک رسی چراتا ہے پھر اس کا ہاتھ کاٹا جائے۔''

یعنی وہ انڈے کی چوری اور رسی کی چوری کو معمولی سمجھ کر کرتا ہے اس طرح چوری میں آگے بڑھتا جاتا اور آخرکار ہاتھ کاٹنے کے نصاب جتنی چوری کرتا ہے اور اپنا ہاتھ کٹوا بیٹھتا ہے۔ یہی زیرمطالعہ حدیث کا مقصد ہے کہ چھوٹے گناہوں، مشتبہ باتوں اور مکروہات کو معمولی سمجھ کر کر لینا یا ان کو اہمیت نہ دینا، احتیاط نہ برتنا اور رخصت کی آخری منزل تک جانا

یہ وہ باتیں ہیں جو آخر کار ایک دن آدمی کو بڑے گناہوں میں مبتلا کر دیں گی اور اسے تباہ کر کے رکھ دیں گی۔

حدیث کے آخر میں آپ ﷺ نے جسم انسانی میں دل کی اہمیت بتائی اور بتایا کہ انسان کے جسم واعضاء کی اصلاح وصلاح اور بہتری و بھلائی انسان کے اس چھوٹے سے عضو سے وابستہ ہے' لہٰذا یہ اگر پاک وصاف ہے، درست وصحیح سلامت ہے، انسان کی سوچ وفکر کا انداز صحیح ہے تو اس کا عملی رویہ اور کردار صحیح ہوگا۔ شکوک وشبہات والے معاملات سے وہ اچھے طریقے سے نمٹ لے گا اور عملی زندگی میں تمام مرحلوں میں سلامتی سے گزرتا جائے گا۔

لیکن اگر یہ بگڑ جائے تو انسانی جسم کا تمام کام بگڑ جائے گا اور انسان تباہی میں جا کر گر جائے گا۔ بعض علماء نے انسان کے اندر سے تعلق رکھنے والے امراض اور قلب ودماغ کی خرابیوں کو گنایا ہے جیسے کینہ، کھوٹ، حسد، لالچ، بخل، تکبر، دوسروں کو حقیر جاننا، دکھاوا، شہرت، مکروفریب، حرص وطمع، تعصب اور نفرت وغیرہ۔ روحانی امراض کے ماہرین نے یہ امراض چالیس (۴۰) تک گنائے ہیں، یہ تمام امراض ایسے ہیں کہ اندر میں پرورش پاتے ہیں پھر ظاہری اعضاء پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

قلب کی سلامتی انسان کی اصلاح میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی پاک کتاب میں فرمایا ہے:

اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ. (شعراء ۲۵)

چنانچہ حضورِ اکرم ﷺ ہر وقت سلامتی قلب کی دعا کرتے رہتے تھے۔ ارشاد ہے:

یَامُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قُلُوْبَنَا عَلٰی دِیْنِکَ یَا مُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ صَرِّفْ قُلُوْبَنَا اِلٰی طَاعَتِکَ.

الغرض یہ حدیث ہمیں شبہات والے کاموں، باتوں اور چیزوں سے بچنے اور شکوک وشبہات والے مقامات سے دور رہنے کی ترغیب دیتی ہے اور دین کو خالص رکھنے اور عزت کی حفاظت کرنے پر ابھارتی ہے اور ساتھ ہی عقل کو جلا دینے، اس سے کام لینے اور سوچ وفکر کے انداز کو صحیح رکھنے پر زور دیتی ہے تاکہ ہمارے اعمال شریعت کے مطابق ادا ہوں اور ایک مومن کی سی زندگی گزرے۔ (آمین)

حدیث نمبر 7

دین کا سراپا خیر خواہی ہونا

عَنْ أَبِی رُقَیَّةَ تَمِیْمِ بْنِ اَوْسٍ الدَّارِیِّ رَضِیَ اللہُ عَنْهُ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ : "اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَةُ" قُلْنَا لِمَنْ؟ قَالَ : لِلّٰهِ وَلِکِتَابِهٖ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَامَّتِهِمْ. (مسلم)

حضرت تمیم داریؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ''دین خیر خواہی کا نام ہے'' ہم نے عرض کیا ''یارسول اللہ! ﷺ کس کی خیر خواہی؟'' فرمایا ''اللہ کی، اس کی کتاب کی، اس کے رسول کی، مسلمانوں کے رہنماؤں کی اور تمام مسلمانوں کی۔''

یہ ایک جوامع الکلم حدیث ہے یعنی جس میں الفاظ تھوڑے ہیں اور مفہوم زیادہ سمویا ہوا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں محمد بن اسلم طوسی کی روایت بیان کی ہے کہ یہ حدیث ان چار احادیث میں سے ایک ہے جن میں دین کی تمام تعلیمات کو اجمالاً سمویا گیا ہے۔

عربی زبان میں نصیحت کا کلمہ اپنے معنی میں بڑی وسعت رکھتا ہے۔ ابن دقیق العید (م ۷۰۲ھ) کہتے ہیں:

''کلام عرب میں ایسا کوئی اور کلمہ نہیں ہے جو اس کلمے کے معانی واضح کر سکے۔''

اُردو میں اس کا ترجمہ خیر خواہی کیا گیا ہے، یہ بھی دراصل اس کے قریبی معنی ہیں۔ نصیحت کا کلمہ نصح سے نکلا ہے جس کے لفظی معنی ہیں ملاوٹ اور کھوٹ سے پاک ہونا۔

مفردات امام راغب میں ناصح العسل: خالصہ یعنی ایسا شہد جو موم وغیرہ سے صاف شدہ ہو، اسی طرح کہا جاتا ہے۔ نصح قلب الانسان یعنی دل میں کسی قسم کا کھوٹ اور کینہ باقی نہ رہے اور انسان کا اندر باہر ایک ہو۔ علامہ خطابی نے اس مفہوم کو اپنی عبارت میں اس طرح ادا کیا ہے:

النصیحة کلمة جامعة معناها حیازة الحظ للمنصوح له"

''نصیحت ایک وسیع معنی والا کلمہ ہے جس کا مفہوم ہے ''جس کی خیر خواہی کی جا رہی ہے، اس کی بھلائی، فائدے اور راحت کے لیے ہر ممکن کوشش کر کے اس کا پورا حق ادا کرنا''

قرآن مجید میں مومنوں کو توبہ نصوح کا حکم دیا گیا ہے یعنی ایسی خالص اور سچی توبہ جو ہر قسم کے نفاق اور دورنگی سے پاک ہو۔ ایک جگہ مومنوں کی شان یہ بتائی گئی:

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلاَ عَلَى الْمَرْضٰى وَلاَ عَلَى الَّذِيْنَ لاَ يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ. (التوبہ۹:۹۱)

''کمزوروں، بیماروں اور ان لوگوں پر کوئی الزام نہیں ہے جو (جہاد کے لیے) خرچ کرنے کے لیے اپنے پاس کچھ نہیں پاتے جبکہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے خیر خواہ (مخلص) ہوں۔''

یعنی عام حالات میں جہاد کے میدان سے روگردانی کرنا ایمان واطاعت کے خلاف ہے لیکن معذوری کی حالت میں اللہ کے ہاں گرفت نہیں ہے بشرطیکہ دل میں اخلاص وفاداری موجود ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ معذور ہونے کی صورت میں بندے سے کچھ احکام میں تخفیف یا معافی ہوسکتی ہے لیکن نصیحت وخیر خواہی کا ہر حالت میں باقی رہنا ضروری ہے اور اس کے سوا نجات ناممکن ہے۔

اس حدیث شریف میں دین کے بارے میں ایک جامع تصور دیا گیا ہے اور دین کا دائرۂ کار بتایا گیا ہے۔ دین کے بارے میں ایک تصور یہ ہے کہ دین کا تعلق صرف اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان ہے یعنی چند عقائد، ذکر وفکر، چند مقرر عبادات اور اخلاقیات سے اپنے رب کو راضی کیا جائے اور زندگی کے دوسرے معاملات اور خاص طور پر اجتماعی

معاملات سے دین کا تعلق نہیں ہے۔ اس سلسلے میں یہ حدیث واضح رہنمائی کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ دین کا دائرہ بہت وسیع ہے جس میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کے بہت سے پہلو شامل ہیں۔ یہ پہلو مختصر اس طرح ہیں:

اَلنَّصِیْحَۃُ لِلّٰہِ (اللہ کے ساتھ خلوص و خیر خواہی) کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر اخلاص وسچائی سے ایمان لائے اور نفاق کو قریب نہ پھٹکنے دے، اللہ کی ذات وصفات، اختیارات، احکامات اور حقوق و آداب میں کسی کو ساجھی وشریک نہ ٹھہرائے، اس کی اطاعت میں لگا رہے، اس کی نافرمانی سے بچتا رہے، اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرے جو اللہ کے فرماں بردار بندے ہیں، ان سے محبت کرے جو نافرمان ہیں، ان سے کنارہ کشی کرے اور اس سے ہی ہر وقت دعا مانگے اور کسی عمل میں بھی اخلاص ووفاداری اور سچائی کو نہ چھوڑے۔ اللہ تعالیٰ سے اخلاص و خیر خواہی اختیار کرنے میں انسان دراصل اپنے آپ سے ہی خیر خواہی کرتا ہے اور اپنی ہی دنیا اور آخرت سنوارتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِہٖ. (حم السجدہ ۴۱:۴۶)

''جو شخص نیک عمل کرتا ہے، وہ اپنی ذات کے لیے ہی کرتا ہے۔''

اَلنَّصِیْحَۃُ لِکِتَابِہٖ (اس کی کتاب سے اخلاص) کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید پر اخلاص سے ایمان لانا کہ یہ اللہ کا کلام ہے، اس کی طرف سے نازل ہوا ہے، اس کی تعظیم کرنا، اس کی تعلیم حاصل کرنا، اس کی عمدگی سے تلاوت کرنا، اس کی معانی اور مطالب کو سمجھنا، اس کی تعلیم میں تفکر و تدبر کرنا، اس کے تمام احکام پر عمل کرنا اور جن پر عمل نہ ہو سکے ان کے روبہ عمل لانے کے لیے جدوجہد کرنا، اس کے دیئے ہوئے اجتماعی نظام کو قائم کرنا، اس کی تعلیم میں جو شبہات پیدا کیے جاتے ہیں، ان سے اپنے آپ کو بچانا اور اس کا دفاع کرنا، اس کی تعلیم عام کرنا، لوگوں کو اس کی تعلیم کی طرف دعوت دینا اور یہ یقین رکھنا کہ اس میں جو کچھ ہے، وہ حق ہے اور میری دنیا وآخرت کی بھلائی وفلاح کے لیے ہے اور میری نجات اس پر عمل پیرا ہونے میں ہے۔

اَلنَّصِیْحَۃُ لِرَسُوْلِہٖ (اس کے رسول کے ساتھ اخلاص) کے معنی ہیں کہ محمد ﷺ کو اللہ کا آخری رسول ماننا، آپ ﷺ کے حقوق وآداب پہنچانا اور انہیں ادا کرنا، آپ ﷺ

سے محبت رکھنا، آپ ﷺ جو شریعت لے کر آئے ہیں اس کی تصدیق کرنا، آپ کی سنتوں کو معلوم کرنا اور ان پر عمل کرنا، آپ ﷺ کے اصحاب سے محبت کرنا، جو آپ کے نافرمان ہیں، ان سے بچ کر رہنا، آپ ﷺ پر درود و سلام بھیجنا، آپ کی سنتوں میں کمی بیشی کرنے والوں اور بدعت کے کام ایجاد کرنے والوں سے دُور رہنا اور جو اسلامی نظام آپ ﷺ لے کر آئے ہیں، اسے قائم کرنا اور آپ ﷺ کی تمام سنتوں پر عمل کرنا۔

اَلنَّصِیْحَةُ لِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِیْنَ (مسلمانوں کے رہنماؤں کی خیر خواہی) کے مطلب پر گفتگو کرنے سے پہلے لفظ ائمہ جو کہ امام کی جمع ہے، کا مفہوم سمجھنا چاہیے۔ عربی میں امام قائد، رہنما اور حاکم کو کہتے ہیں۔ لفظ ائمہ میں ہر قسم کے رہنما شامل ہیں جیسے وقت کا حاکم، دینی رہنما، دینی جماعتوں کے پیشوا اور قائدین وغیرہ۔

ان سے خیر خواہی کا مطلب ہے نیکی، بھلائی اور حق و انصاف کے کاموں میں ان کا اخلاص سے ساتھ دینا، ان کی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں ان کا ہاتھ بٹانا، تابع داری کرنا، انہیں حق بات کہنا اور ان کی کوتاہیوں سے انہیں آگاہ کرنا۔ امام خطابی نے کہا ہے ان کی خیر خواہی یہ بھی ہے کہ ان کے پیچھے نماز پڑھی جائے، ان سے مل کر جہاد کیا جائے، انہیں زکوٰۃ ادا کی جائے اگر کوئی بُرائی ان سے ظاہر ہو تو ان کے خلاف طاقت کے ذریعے بغاوت کی جائے، ان کی جھوٹی خوشامد نہ کی جائے اور ان کی اصلاح و بھلائی کے لیے دعا کی جائے۔

اَلنَّصِیْحَةُ لِعَامَّتِهِمْ (عام مسلمانوں سے خیر خواہی) اس بارے میں علامہ ابن دقیق العید ان کے اخلاقی، معاشرتی، معاشی اور قانونی حقوق ادا کرنے کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''دنیا اور آخرت کی بھلائی والے کاموں میں ان کی رہنمائی اور مدد کرنا، ان کی لازمی ضروریات پوری کرنا، ان کے عیوب کی ستر پوشی کرنا، ان سے مصیبتیں ٹالنا، ان کی بھلائی کے لیے سوچنا، نرمی، اخلاص اور دردمندی سے نیکی کا حکم دینا، بُرائیوں سے روکنا، ان پر رحم و شفقت کرنا، بڑوں کی عزت کرنا، چھوٹوں پر شفقت کرنا، ان سے دھوکہ اور حسد نہ کرنا، جو بات اپنے لیے پسند ہو، ان کے لیے بھی پسند کرنا، ان کی عزتوں اور مالوں کی حفاظت کرنا، بیماروں کی

عیادت کرنا، ظالم کو ظلم سے روکنا، مظلوم کی دادرسی کے لیے جدوجہد کرنا، کوئی فوت ہو جائے تو اس کے جنازے میں شریک ہونا اور اس کے پس ماندگان کو تسلی دینا۔''

یہ ہے دین کے خیرخواہ ہونے کا مختصر اور جامع نقشہ جو اس حدیث شریف سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ دراصل دین کا تعلق انسان کی پوری زندگی سے ہے جس میں پوری انفرادی اور اجتماعی زندگی شامل ہے اور اس کی بنیاد پر قائم ہونے والے اسلامی معاشرے میں ہر طرف خیرخواہی اور ایک دوسرے کی بھلائی کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ ایسا معاشرہ رحمت وشفقت، امن سلامتی، حقوق وفرائض اور محبت واخلاص والا ہوتا ہے جس میں ہر انسان عزت واحترام سے پیار ومحبت کے ساتھ بے خوفی سے امن وسکون کی زندگی گزارتا ہے۔

ایسا معاشرہ اس وقت قائم ہوسکتا ہے جب ہر ایک مسلمان اپنے فرائض وذمہ داریوں کے احساس سے اسلام کے تمام احکام پر اخلاص، سچائی، ایمان داری اور خیرخواہی کے جذبے سے خود عمل کرے اور دوسرے بھائیوں کو بھی ان باتوں کی تلقین وتبلیغ کرے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ایسا معاشرہ ہمیں نصیب کرے۔ (آمین)

حدیث نمبر 8

جہاد اور مسلمان کی حرمت

عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ اَنَّ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ قَالَ "أُمِرْتُ اَنْ أَقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوْا اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللهِ وَيُقِيْمُوا الصَّلاَةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ فَإِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّىْ دِمَاءَ هُمْ وَاَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّ الْإِسْلَام وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللهِ تَعَالٰى. (بخاری ومسلم)

"حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اس وقت تک لوگوں سے جنگ کروں جب تک وہ کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی گواہی نہ دے دیں اور جب تک وہ نماز قائم نہ کریں اور زکوٰۃ نہ دیں پھر جب وہ یہ کام کرلیں تو مجھ سے اپنی جان اور مال کو محفوظ کرلیں گے۔ الا یہ کہ اسلام کے کسی حق کی وجہ سے ان کا خون بہانا یا مال لے کر کسی دینا ضروری ہو۔ بہرحال ان کا اصل حساب تو اللہ کے ذمہ ہے۔"

تشریح:

یہ ایک اہم حدیث ہے جس میں دین کے بنیادی قواعد میں سے ایک اہم قاعدے یعنی جہاد (قتال) کا بیان اور اس کا مقصد واضح کیا گیا ہے۔ اس حدیث سے ملتی جلتی ایک روایت حضرت انس کی اس طرح ہے:

"یہاں تک کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ (معبود) نہیں ہے اور محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔"

انسانوں کے لیے دنیا میں زندگی گزارنے کا بہترین طریقہ اسلام ہی ہے، قیامت

تک آنے والے انسانوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسے مقرر اور پسند کیا ہے اور اسے چھوڑ کر آخرت کی نجات ہوگی اور نہ ہی اللہ تعالیٰ راضی ہوگا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَام. (آل عمران ۳:۱۹)

''بلاشبہ (پسندیدہ) دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔''

اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِیْنَ. (آل عمران ۳:۱۹)

''اور جس نے اسلام کو چھوڑ کر کوئی اور دین چاہا تو اس سے وہ ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں گھاٹے والوں میں سے ہوگا۔''

اللہ کے اس پسندیدہ دین یعنی اسلام کو دنیا میں پھیلانے، بھولے بھٹکے انسانوں تک یہ پیغام پہنچانے، اسلام کی نعمت کو عام کرنے اور اشاعتِ اسلام کی راہ میں آڑے آنے والی رکاوٹوں کو دُور کرنے کے لیے مسلمانوں پر جہاد لازم کیا گیا ہے۔ دینِ اسلام میں جہاد بنیادی احکام میں سے ایک اہم حکم ہے اور قیامت تک جاری رہے گا، حالات کیسے بھی ہوں اسے منسوخ ومعطل نہیں کیا جاسکتا البتہ زمان ومکاں کے لحاظ سے اور اس کی شرائط پوری نہ ہونے کی بناء پر مؤخر کیا جاسکتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ایک ارشاد ہے:

اَلْجِهَادُ مَاضٍ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَا یُبْطِلُهٗ جَوْرُ جَائِرٍ وَلَا عَدْلُ عَادِلٍ

''جہاد قیامت تک جاری رہے گا، اسے کسی ظالم کا ظلم اور کسی عادل کا عدل ختم نہیں کرسکتا۔'' (   )

قرآن وحدیث اور تعامل اُمت (اُمت کے قول وعمل) سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاد مختلف صورتوں، کیفیتوں اور حالات کے مطابق مسلمانوں پر فرض عین یا فرض کفایہ ہے اور رہے گا۔

اسلام میں جہاد کے جو مقاصد بیان کیے گئے ہیں، ان میں سے بعض اہم یہ ہیں:

(۱) انسانوں کو غیر اللہ کی بندگی، غلامی اور پوجا پرستش سے نکال کر اللہ کی بندگی کے نظام میں لانا اور اللہ کی بندگی کا نظام قائم کرنا جسے ''اسلامی حکومت'' کے نام سے موسوم کیا

جاتا ہے، جہاد فی سبیل اللہ کا بڑے سے بڑا مقصد یہی ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں جب ایرانیوں سے جنگ جاری تھی تو ایک موقع پر ایک ایرانی جنرل نے اسلامی لشکر کے ایک ذمہ دار سے پوچھا ''تم لوگ ہمارے ملک پر کیوں چڑھائی کر کے آئے ہو؟'' اس نے جواب میں کہا:

اَللّٰہُ ابْتَعَثَنَا لِنُخْرِجَ النَّاسَ مِنْ عِبَادَۃِ النَّاسِ اِلٰی عِبَادَۃِ اللّٰہِ وَمِنْ ظُلْمَۃِ الْکُفْرِ اِلٰی نُوْرِ الْاِسْلَامِ. (البدایۃ والنھایہ)

''اللہ تعالیٰ نے ہمیں بھیجا ہے تاکہ انسانوں کو انسانوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں لائیں اور کفر کے اندھیروں سے نکال کر اسلام کی روشنی میں لائیں۔''

جہاد کا اہم مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو کفر، شرک، توہم پرستی، ریتوں، رسموں کے جال سے نکال کر اسلام کی شاہراہ پر لانا اور خدا کی زمین پر خدا کا بندہ بن کر رہنے کے لیے آزادی دینا اور دلانا ہے۔

(۲) انسانوں کو ہر قسم کے استحصال، ظلم اور جور و جبر سے نجات دلانا، ان کو عزت و احترام، مساوات اور شرف کا مقام دلانا، بوڑھوں، عورتوں، بچوں اور کمزور طبقات کے لوگوں کو ظالموں کے ظلم سے چھڑانا۔

(۳) بدامنی، بے اطمینانی، لوٹ مار اور خوف و دہشت سے انسانیت کو آزاد کرانا تاکہ انسان امن و سکون، اطمینان و سلامتی والی زندگی گزار سکے۔

(۴) اللہ کے دین کو غالب کرنے، قائم کرنے، آزادی سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے اور شرافت کی فضا قائم کرنے میں رکاوٹ ڈالنے اور مزاحمت کرنے والی قوتوں کو دبانا اور ان کا زور توڑنا ایک اہم مقصد ہے۔ اس طرح اسلامی حکومت کو نقصان پہنچانے والی طاقتوں کا زور توڑنا اور ایسی تحریکوں کا سدباب کرنا ہے۔

(۵) ایسی اسلامی حکومت قائم کرنا جس میں اللہ کا پورا دین نافذ اور جاری ہو، جس میں کفر و شرک اور غیر اللہ کی حاکمیت نہ ہو اور زندگی کے تمام شعبوں اور گوشوں میں اسلام نافذ ہو اور دوسرے ادیان و مذاہب اگر رہیں تو اسلام کے ماتحت اور زیردست ہو کر

رہیں۔

اس حدیث پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور میں اس وقت عمل ہوا جب نبی ﷺ کی وفات کے بعد بعض قبیلوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تو حضرت صدیقؓ نے ان سے جنگ کرنے کا عزم کیا اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ تم ایسے لوگوں سے جنگ کر رہے ہو جو لا الہ الا اللہ کہتے ہیں، اس پر صدیق اکبرؓ نے یہ حدیث پڑھی اور پھر فرمایا:

اِن الزَّکَاۃَ حَقُّ الْمَالِ وَقَالَ وَاللّٰہِ لَوْ مَنَعُوْنِیْ عَنَاقًا (وَفِیْ رِوَایَۃٍ عِقَالاً) کَانُوْا یُؤَدُّوْنَہٗ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ لَقَاتَلْتُھُمْ عَلٰی مَنْعِہٖ فَتَابَعَہٗ عَلٰی قِتَالِ الْقَوْمِ۔

''زکوٰۃ مال کا حق ہے (اور کہا) اللہ کی قسم! اگر انہوں نے مجھ سے ایک اونٹ بھی روکا (اور ایک روایت میں ہے، ایک اونٹ باندھنے کی رسی روکی) جو رسول اللہ ﷺ کو ادا کرتے تھے تو میں اس پر بھی لڑوں گا) اس پر حضرت عمرؓ نے جنگ کرنے کے معاملے میں ان کی پیروی کی۔'' (طبری)

زکوٰۃ کے انکار پر جنگ کرنے پر تمام صحابہ کرامؓ کا اجماع اتفاق ہے اس سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص مسلمان ہو کر پھر اسلام کی بنیادی باتوں میں سے کسی ایک کا انکار کرے تو وہ مرتد ہے اور مرتد کی سزا قتل ہے۔

اس حدیث میں جہاد کا بیان آیا ہے اور صرف ایک نقطہ بیان ہوا ہے۔ کسی قوم یا ملک سے جہاد (قتال) شروع کرنے کے تین درجے ہیں۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ انہیں اسلام کی دعوت دی جائے گی اگر خوشی سے یہ لوگ اسلام قبول کر لیں تو انہیں مسلمانوں والے تمام حقوق حاصل ہو جائیں گے اور مسلمانوں کے برابر کے شہری بن جائیں گے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ اسلام قبول کرنے سے انکار کریں اور اسلامی حکومت کے ذمی بن کر رہیں تو بھی انہیں اجازت ہے البتہ یہ جزیہ ادا کریں گے جو ایک قسم کا ہلکا ٹیکس ہے جو ان کی حفاظت اور دیگر ضروریات پوری کرنے کے لیے ہے۔

تیسرا درجہ یہ ہے کہ یہ لوگ جزیہ دے کر ذمی بن کر رہنے سے انکار کریں اور اسلامی حکومت کی ماتحتی قبول نہ کریں تو پھر ان سے جہاد کیا جائے گا۔ اس تیسرے درجے کا بیان

حدیث زیرِ مطالعہ میں کیا گیا ہے۔

اس حدیث سے ایک اہم بات یہ معلوم ہوئی کہ اسلام میں جہاد کا مقصد مسلمانوں کی حکومت قائم کرنا، مال کھپانے کی منڈیاں تلاش کرنا، لوٹ مار کرنا، حکومت کی سرحدیں بڑھانا، خام مال حاصل کرنا اور لوگوں کو غلام بنانا نہیں ہے۔ اس کا مقصد تو اللہ کی وحدانیت قائم کرنا، رسول اللہ ﷺ کی نبوت پہنچانا اور نماز وزکوٰۃ کا پاکیزہ اور اصلاحی نظام قائم کرنا ہے۔

حدیث میں روزے اور حج کا بیان نہیں ہے کیونکہ یہ عبادتیں ایک لحاظ سے انفرادی یا خفیہ ہیں، کوئی شخص روزہ نہ رکھے اور کہے کہ میں نے روزہ رکھا ہے تو اس کی یہ بات قبول کر لی جائے گی۔ اس طرح حج کے بارے میں کوئی کہے کہ مجھ میں استطاعت نہیں ہے تو زیادہ کھینچا تانی نہیں کی جائے گی اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالے کر دیا جائے گا جو روزِ قیامت خود حساب لے گا۔ شریعت ظاہر سے وابستہ ہے اور کسی کے اندر کا حال معلوم کرنے کے درپے نہیں ہونا چاہیے۔

حدیث میں ایک فقرہ ہے اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ یعنی اسلام کے قواعد سے کسی کی جان لینا ضروری ہو تو شرعی قواعد کے مطابق لی جائے گی۔

حدیث نمبر 9

سوالات کی کثرت

عَنْ أَبِی هُرَیْرَةَ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ صَخْرٍ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ یَقُوْلُ : "مَا نَهَیْتُکُمْ عَنْهُ فَاجْتَنِبُوْهُ وَمَا أَمَرْتُکُمْ بِهٖ فَأْتُوْا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ، فَإِنَّمَا أَهْلَکَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ کَثْرَةُ مَسَائِلِهِمْ وَاخْتِلَافُهُمْ عَلٰی أَنْبِیَآئِهِمْ." (رواہ البخاری ومسلم)

''حضرت ابوہریرہ عبدالرحمٰن بن صخرؓ نے روایت کی کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے فرماتے ہوئے سنا ''میں نے تمہیں جن کاموں سے روکا ہے، ان سے اجتناب کرو اور جن باتوں کا حکم دیا ہے جہاں تک ہو سکے (کوشش کے ساتھ) انہیں ادا کرو (اور خواہ مخواہ سوالات میں مت پڑو) کیونکہ پہلی اُمتوں کے لوگوں کو زیادہ سوال کرنے اور نبیوں کے خلاف چلنے کے طرزِ عمل نے ہلاک کیا۔''

تشریح:

یہ حدیث ان بنیادی حدیثوں میں سے ایک ہے جن میں اسلام کے اہم قواعد بیان کیے گئے ہیں اور جوامع الکلم میں سے بھی ہے یعنی تھوڑے سے الفاظ میں فقہ کے کئی اہم قاعدے بیان ہوئے ہیں۔

اس حدیث کا پس منظر یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک مرتبہ تقریر کی جس میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''لوگو! اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے، سو حج کریں۔'' اس پر ایک شخص نے کہا ''کیا ہر سال حج کریں؟'' آپ ﷺ خاموش رہے۔ اس آدمی نے یہ سوال تین

مرتبہ کیا اس پر آپ ﷺ نے فرمایا ''اگر میں ہاں کہہ دیتا تو تم پر ہر سال حج واجب ہو جاتا اور تم میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ ہر سال حج کر سکو پھر آپ ﷺ نے فرمایا ''جو بات میں نے نہیں کہی اور تمہیں آزاد چھوڑا ہے، تم اس کے پیچھے نہ پڑو۔'' اس کے بعد مذکورہ بالا حدیث کے الفاظ ارشاد فرمائے۔

اس حدیث میں چار باتیں ارشاد ہوئی ہیں جن کی مختصر تشریح کی جا رہی ہے:

(۱) جن باتوں، کاموں اور عملوں سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے منع کیا ہے، انہیں ''منہیات'' کہتے ہیں۔ یہ منہیات بعض حرام ہیں تو بعض مکروہ ہیں، ان کے بارے میں مومن کا رویہ یہ ہونا چاہیے کہ چونکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ان کاموں سے روکا ہے اس لیے ان کے کرنے میں ضرور میرا نقصان وزیاں ہے، سو لازماً ان سے بچنا چاہیے۔ حدیث میں منہیات سے رُکنے کے لیے اپنی استطاعت کے مطابق کی شرط نہیں لگائی گئی ہے، اس سے بعض علماء نے یہ استدلال کیا ہے کہ منہیات سے رُکنا مامورات کی ادائیگی سے زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ خود کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ سے بھی اس طرف اشارہ نکلتا ہے کہ آدمی پہلے اپنے آپ کو ہر قسم کی بُرائی جیسے خراب عقائد، بُرے خیالات، غلط نظریات اور بُرے اعمال سے پاک کرے تب اس کی روح وبدن پر اعمال صالحہ کے اثرات وثمرات ظاہر ہوں گے۔ پھر اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ بُرائی سے بچنے کے لیے سر توڑ کوشش کی جائے اور تھوڑے بہت عذر بہانے کی وجہ سے اس میں مبتلا نہ ہوا جائے البتہ اگر ایسی مجبوری ہو جسے شریعت میں اضطراری حالت کہتے ہیں جس میں جان جانے یا کسی عضو کے تلف ہونے یا کسی بڑی مصیبت میں مبتلا ہونے کا واضح خطرہ ہو تو بحالتِ مجبوری اس فعل (منہی) کو آدمی بقدر ضرورت اس اصول کے مطابق (اَلضَّرُوْرَاتُ تُبِیْحُ الْمَحْظُوْرَاتِ) کرسکتا ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے جن باتوں، کاموں اور عملوں کے کرنے کا حکم (امر) دیا ہے، انہیں ''مامورات'' کہا جاتا ہے۔ یہ مامورات بعض فرض، بعض واجب، بعض سنت اور مستحب ہیں۔ مامورات پر عمل کرنے کے سلسلے میں مومن کے

سامنے یہی بات ہونی چاہیے کہ ان کے ادا کرنے میں میرا بھلا اور فائدہ ہے، چاہے مجھے سمجھ میں آئے یا نہ آئے اور بے شمار حکمتیں اور مصلحتیں ہیں، چاہے مجھے معلوم ہوں یا نہ ہوں۔

امر کی ادائیگی کے لیے حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا ہے ''جہاں تک ہو سکے'' اس بات کو قرآن مجید کی دو آیتوں:

(الف) لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَھَا (البقرۃ ۲:۲۸۶)

(ب) وَمَا جَعَلَ عَلَیۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ مِنۡ حَرَجٍ. (الحج ۲۲:۷۸)

سے ملا کر دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ دین میں تنگی نہیں بلکہ آسانی اور کشادگی ہے، اسی بنیاد پر کتنے ہی فقہی مسائل نکلتے ہیں جیسے کوئی شخص کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھ سکے تو بیٹھ کر پڑھ لے اور اس پر بھی قادر نہیں تو لیٹ کر پڑھ لے۔ وضو میں کسی عضو کو دھونا نقصان دے تو اسے چھوڑ کر باقی کو دھو لے اور اس پر مسح کرے، اپنے اہل وعیال کو نان ونفقہ بقدر استطاعت ہی دے اور بُرائی کو روکنے کا کام اپنی استطاعت کے مطابق ہی کرے۔

(۳) ''زیادہ سوال کرنے'' سے مراد ہے، دینی مسائل پوچھنے، سمجھنے اور معلوم کرنے کے لیے سوال کرنا۔ مسائل پوچھنے کے لیے سوالات کرنے کی وجوہات اور مقاصد کئی ہو سکتے ہیں جنہیں پیشِ نظر رکھ کر لوگ سوال کرتے ہیں۔ ان میں چند ایک یہ ہیں:

(الف) کسی انجان اور جاہل آدمی کا دینی فرائض معلوم کرنے کے لیے سوالات کرنا جیسے نماز، روزے، زکوٰۃ، حرام وحلال اور تجارت وغیرہ کے مسائل معلوم کرنا۔ ایسے سوالات بقدرِ ضرورت پوچھنا فرض ہے اور ان کے بارے میں خاموش رہنا اور شرم کرنا جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَاسۡئَلُوۡٓا اَھۡلَ الذِّکۡرِ اِنۡ کُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ. (النحل ۱۶:۴۳)

''علم والوں سے پوچھو اگر تم نہیں جانتے''

حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

طَلَبُ الۡعِلۡمِ فَرِیۡضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسۡلِمٍ. (بخاری شریف)

''تمام مسلمانوں پر علم کا طلب کرنا فرض ہے۔''

(ب) دوسری قسم یہ ہے، دین کی گہری فہم پیدا کرنے کے لیے سوال کرنا جیسے قضا اور فتویٰ کے لیے علم حاصل کرنا، یہ فرض کفایہ ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ. (التوبہ۹:۱۲۲)

''پس کیوں نہ ہر گروہ میں سے ایک ٹولی (علم کی تلاش میں) نکلی تا کہ دین کی اچھی طرح سمجھ پیدا کر لیتی۔''

اور حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

اَلَا فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ. (متفق علیہ)

''سنو! یہاں جو حاضر ہیں، وہ غیر حاضر کو بتائیں۔''

ایسے سوالات معاشرے کے چند لوگوں کے کرنے سے باقی لوگوں پر سے فرض ساقط ہو جاتے ہیں۔

(ج) تیسری قسم یہ ہے کہ کسی شخص کا علم معلوم کرنے، یا اسے پریشان کرنے اور شرمندہ کرنے کے لیے سوال کرنا، اخلاقی لحاظ سے بلاضرورت ایسا کرنا مناسب اور جائز نہیں ہے البتہ دینی و دنیاوی ضرورت ہو جیسے کسی کو کسی کام سے لگانے یا کوئی ذمہ داری حوالے کرنے کے لیے سوال کرنا، اس مقصد کے لیے ایسے سوال کرنا جائز ہے۔ اسی زمرہ میں طالبِ علموں سے امتحان لینا اور سوالات کرنا بھی شامل ہے۔

(د) چوتھی قسم ہے کہ ایسی باتوں کے بارے میں سوال کرے جو اللہ تعالیٰ نے اس پر اور دوسروں پر واجب نہیں کی ہیں یعنی غیر ضروری چیزوں اور مسائل کے بارے میں پوچھنا، مذکورہ بالا حدیث میں ایسے سوالات کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ ہم نے تمہید میں بتایا ہے کہ ایک شخص حج کے بارے میں خواہ مخواہ سوال کر رہا تھا۔ ضرورت سے زیادہ سوالات کرنے کی پابندی حضورِ اکرم ﷺ کے زمانے میں تھی۔ ارشادِ ربانی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ.

(المائدہ۵:۱۰۱)

''اے ایمان والو! اشیاء (چیزوں) کے بارے میں زیادہ سوال نہ کرو اگر بات واضح ہوگئی تو تم ہی تکلیف میں مبتلا ہو جاؤ گے۔''

یعنی جن باتوں پر اپنی سہولت کے مطابق عمل کر رہے ہو، کیے جاؤ اور عمل کرنے میں جو آزادی ہے، اس پر قدغن نہ لگاؤ اور خواہ مخواہ سوالات کر کے اپنے اوپر اس طرح کی پابندیاں عائد نہ کرو جس طرح بنی اسرائیل نے اپنے اوپر عائد کر لیں جب انہیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا تو کوئی ایک گائے پکڑ کر ذبح کر دیتے لیکن انہوں نے سوال در سوال کیے اور اپنے اوپر پابندیاں لگواتے گئے اور جو سہولتیں تھیں، وہ ختم کراتے گئے تا آنکہ قیمت اور حصول میں ایک گراں ترین گائے پر معاملہ جا کر رُکا اور بہت مہنگی خریدنی پڑی۔

بہت سے لوگوں میں سوالات کرنے کی عادت ہوتی ہے اور ان کا پسندیدہ مشغلہ ہوتا ہے سو سوال در سوال کیے جاتے ہیں اور غیر ضروری اور غیر عملی سوالات کرتے ہیں اس قسم کا طرزِ عمل وہ لوگ اختیار کرتے ہیں جو عمل نہیں کرنا چاہتے اور یہ چاہتے ہیں کہ حیلے بہانے سے چھوٹ مل جائے۔ بعض علماء نے فقہ افتراضی کو بھی اسی میں شمار کیا ہے۔ آج کل ہمارے معاشرے میں بھی اس قسم کے سوالات کی بھرمار ہے جیسے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا نام کیا تھا؟ آدم علیہ السلام کا قد کتنا تھا؟ آدم علیہ السلام نے جس درخت سے پھل کھایا تھا، وہ کون سا تھا؟ اصحابِ کہف کے کتے کا رنگ کیا تھا؟ حالانکہ یہ وہ باتیں ہیں جن کے بارے میں قیامت کے دن ہرگز کوئی سوال نہیں ہوگا، وہاں تو عمل پوچھے جائیں گے اور حقوق و فرائض کا سوال ہوگا۔ حضورِ اکرم ﷺ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے ''اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے قیل وقال، کثرت سوال اور اضاعۃ مال کو ناپسند فرمایا ہے۔'' (مشکوٰۃ)

(۴) حدیث میں ایک فقرہ ہے ''نبیوں کے خلاف چلنے کے طرزِ عمل نے انہیں ہلاک کیا''

انبیاء کرام اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کی بناء پر کامل ہدایت، حق اور صداقت پر ہوتے ہیں لہٰذا ان کی ہر بات حق ہوتی ہے اس لیے مسلمان کو قدم قدم پر زندگی کے تمام معاملات میں دیکھنا چاہیے کہ میں کہیں اپنے نبی ﷺ کے خلاف تو کوئی کام نہیں کر رہا ہوں اور مجھ سے کوئی نافرمانی تو سرزد نہیں ہو رہی کیونکہ نبی کے خلاف ہونے میں

انسان کا نقصان ہی نقصان ہے، دنیا وآخرت کا نقصان ہے۔

خلاف پیمبر کسے رہ گزید   کہ ہرگز بہ منزل نخواہد رسید

جس شخص نے پیغمبر کی راہ چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کی تو وہ منزلِ مقصود پر ہرگز نہیں پہنچے گا۔

آج مسلم اُمت میں اتنے اختلافات، فرقے، تفرقے، مصنوعی مسلک اور طریقے ہونے کی ایک وجہ مسلمانوں کا دین کی بنیادی، عملی اور ضروری اور اہم باتیں چھوڑ کر فروعی، اختلافی، غیر عملی اور غیر اہم باتوں میں پڑ جانا ہے۔ آج کل دینی بحث ومباحثے اور مناظرے یا مجادلے ایسی باتوں اور مسائل پر ہوتے ہیں جن کا عملی زندگی سے تعلق کم اور نظری اور بحث برائے بحث والی باتوں سے زیادہ ہوتا ہے اس لیے اُمت اچھے اعمال سے دُور ہوگئی ہے اور ایسی باتوں میں پھنس کر رہ گئی ہے جو عمل سے اور دُور لے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے طرزِ عمل سے محفوظ رکھے جو اس حدیث میں ارشاد کی ہوئی باتوں کے خلاف ہو۔ (آمین)

حدیث نمبر 10

پاک وحلال رزق اور دعا کی قبولیت

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ : اِنَّ اللهَ تَعَالٰی طَیِّبٌ لَا یَقْبَلُ إِلَّا طَیِّبًا، وَإِنَّ اللهَ أَمَرَ الْمُؤْمِنِیْنَ بِمَا أَمَرَبِهِ الْمُرْسَلِیْنَ فَقَالَ تَعَالٰی: یٰٓأَیُّهَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبَاتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا وَقَالَ تَعَالٰی: یٰٓأَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاکُمْ، ثُمَّ ذَکَرَ الرَّجُلِ یُطِیْلُ السَّفَرَ أَشْعَثَ اَغْبَرَ یَمُدُّیَدَیْهِ إِلٰی السَّمَآءِ: یَارَبِّ، یَا رَبِّ، وَمَطْعَمُهُ حَرَامٌ وَمَشْرَبُهُ حَرَامٌ وَمَلْبَسَهُ حَرَامٌ وَغُذِیَ بِالْحَرَامِ، فَاَنّٰی یُسْتَجَابُ لَهُ؟ (رواہ مسلم)

''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''انسانو! اللہ طیب (پاک) ہے اور وہ صرف پاک مال ہی قبول کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو بھی اسی بات کا حکم دیا ہے جس کا اس نے رسولوں کو دیا ہے۔ رسولوں کے لیے اس کا ارشاد ہے (اے رسولو! پاک اور حلال رزق کھاؤ اور نیک عمل کرو) اور مومنوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا (اے ایمان والو! ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے حلال اور پاک چیزیں کھائیں) اس کے بعد آپ ﷺ نے ایک ایسے شخص کا بیان فرمایا جو طویل سفر کر کے ایک مقدس مقام پر پہنچتا ہے، وہ گرد میں اٹا ہوا ہے، اس کے بال پراگندہ ہیں اور وہ آسمان کی طرف ہاتھ پھیلا کر دعا مانگتا ہے، اے میرے رب! اے میرے رب! جب کہ اس کی حالت یہ ہے کہ اس کی غذا حرام کی ہے، اس کا پینا حرام کا ہے، اس

کا لباس حرام کا ہے اور وہ حرام سے پلا ہے پس اس شخص کی دعا کیسے قبول ہو گی؟''

تشریح:

''طیب'' اللہ کی صفات میں سے ایک صفت ہے جس کے معنی ہیں عیوب ونقائص سے پاک ہونا اس صفت کا ہم معنی دوسرا لفظ قدوس (پاک) ہے۔ کلمہ شریف (لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ) کو کلمہ طیبہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کے پڑھنے اور شعور کے ساتھ دل میں بٹھانے سے آدمی کفر وشرک کی گندگیوں سے پاک وصاف ہو جاتا ہے۔

اس حدیث میں آپ ﷺ نے قرآن مجید کی جن دو آیتوں کی طرف اشارہ کیا ہے، یہ بقرہ کی آیت ۶۸ اور المومنون کی آیت ۵۱ ہیں لہٰذا اس حدیث کا مطالعہ کرتے وقت یہ دو آیتیں سامنے رہنی چاہئیں۔ طیبات (پاکیزہ رزق) سے مراد ایسی چیزیں ہیں جو بذاتِ خود بھی پاکیزہ ہوں اور حلال وجائز طریقے سے حاصل کی گئی ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں اور مومنوں کو پاک رزق کھانے کا حکم دے کر یہ رہنمائی کی ہے کہ مومن مال اور رزق کمانے سے پہلے سوچتا ہے کہ جو کاروبارِ تجارت میں کر رہا ہوں، یہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے مطابق ہے یا نہیں؟ یہ جائز ہے یا ناجائز؟ یہ حرام ہے یا حلال؟ یہی وہ بنیادی نقطہ نگاہ ہے جو ایک مسلم اور غیر مسلم کے درمیان فرق کرتا ہے، غیر مسلم بس دیکھتا ہے کہ دولت آئے پھر چاہے کسی طریقے سے آئے اور کہیں سے آئے اور جیسے آئے بس آئے سہی' لیکن اگر کوئی مسلمان بھی مال کمانے میں یہی طرزِ عمل اختیار کرتا ہے تو اسے سوچنا چاہیے کہ آخر میں مسلمان ہو کر اللہ کا بندہ بن کر اور محمد ﷺ کا اُمتی بن کر کیا کر رہا ہوں اور کہیں یہ رویہ کافروں اور اللہ کے باغیوں جیسا تو نہیں ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے طیبات (پاکیزہ رزق) کھانے کی ہدایت کر کے رہبانیت اور دنیا پرستی کے درمیان اسلام کی راہ اعتدال کی رہنمائی کی ہے۔ مسلمان نہ تو راہب (تارک دنیا) کی طرح اپنے آپ کو پاکیزہ رزق اور اللہ کی نعمتوں سے محروم کرتا ہے اور نہ ہی دنیا پرست اور نفس کے غلام کی طرح حلال وحرام کی تمیز کیے بغیر ہر چیز میں منہ مارتا رہتا ہے۔

عمل صالح سے پہلے طیبات کھانے کی ہدایت سے اس بات پر واضح اشارہ ہے کہ

حرام خوری کے ساتھ عمل صالح کے وہ اثرات اور برکات نہیں ہوتے جو اس سے مطلوب ہیں کیونکہ نیکی کی قبولیت کے لیے اوّلین شرط یہ ہے کہ آدمی حلال روزی کھائے، پیئے اور حلال کپڑا پہنے۔

حضورِ اکرم ﷺ کے اس فرمان ''وہ صرف پاک مال ہی قبول کرتا ہے'' سے یہ مسئلہ نکلتا ہے کہ حرام مال سے خیرات وصدقات کرنا جائز نہیں ہے ایسی خیرات مقبول تو کیا ہوگی بلکہ اُلٹی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب اور گناہ کا باعث بنے گی۔

لہٰذا کسی شخص کے پاس ناجائز اور حرام کا مال ہو تو ثواب کی نیت سے خیرات ہرگز نہ کرے لیکن اسے گندگی سمجھتے ہوئے غیر مسلموں یا مصیبت کے مارے ہوئے اور اضطراری (مجبوری کی) حالت میں مبتلا مسلمانوں کو دے دے اس طرح ردی چیز اور شک وشبہ والی چیز بھی خیرات میں دینا مناسب نہیں ہے بلکہ مکروہ ہے۔ ایسا ہی حکم دوسرے اعمال وحسنات کا ہے یعنی نیکی بھی خالص اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لیے کی جائے اور اس میں ریا، خودنمائی، شہرت یا کسی دنیاوی غرض کا شائبہ نہ ہونا چاہیے۔

قبولیت دعا کی اہم شرط یہ ہے کہ دعا مانگنے والا حلال کھائے پیئے اور حلال کا کپڑا پہنے۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کے پاس یہ آیت (یَـآیُّهَا النَّاسُ کُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا) (بقرہ۲:۱۶۸) تلاوت کی گئی تو سعد بن ابی وقاص نے کھڑے ہو کر عرض کیا ''یارسول اللہ! ﷺ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ وہ مجھے مستجاب الدعوۃ (دعا کے مقبول ہونے والا) بنا دے'' اس پر آپ ﷺ نے فرمایا ''اپنا کھانا پاکیزہ بناؤ، مستجاب الدعوۃ ہو جاؤ گے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں محمد ﷺ کی جان ہے جو آدمی اپنے پیٹ میں حرام کا ایک لقمہ ڈالتا ہے تو اس سے چالیس دن کی عبادت قبول نہیں ہوتی اور جس بندے کا گوشت حرام غذا اور سود سے بنا ہے، وہ آگ کے زیادہ لائق ہے۔ پس جس شخص کا کھانا اور پینا حرام کا ہے اور جسم پر کپڑا حرام کا پہنا ہوا ہے تو اس کی دعا قبول نہیں ہوگی اس حالت کو آپ ﷺ نے ایک مثال دے کر سمجھایا کہ ایک شخص کسی نیک کام اور بھلائی کے سفر پر نکلا ہے جیسے حج، جہاد اور تبلیغ وغیرہ۔ ایسے مواقع پر عام طور پر قبولیت دعا زیادہ سے زیادہ ہوتی ہے پھر اس شخص کی حالت وکیفیت بھی عجز وانکساری

کی ہے یعنی دُور سے چل کر آ رہا ہے، بال پراگندہ ہیں اور جسم مٹی میں اَٹا ہوا ہے پھر ایسی حالت میں اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر اور گڑگڑا کر دعا کرتا ہے لیکن پیٹ میں حرام کا لقمہ ہونے اور جسم پر حرام کا کپڑا ہونے کی وجہ سے وہ دعا قبول نہیں ہوتی۔

آج ہماری دعائیں بے اثر کیوں ہیں؟ عبادات میں وہ اثرات کیوں نہیں ہیں اور ہماری دعوت وتبلیغ میں وہ پذیرائی اور اشاعت کیوں نہیں ہے جو بزرگوں اور صلحاء کی دعاؤں، عبادتوں، دعوت وتبلیغ اور گفتگو میں تھی' اس بات کو ہر شخص تھوڑے سے غور وفکر اور تامل سے سمجھ سکتا ہے کہ اس وقت ہمارے معاشرے میں ناجائز آمدنیوں، حرام کی کمائیوں، رشوتوں، سود، جوا (جیسے لاٹریاں، رفیل ٹکٹ، انشورنس، پرائز بانڈ، لائف انشورنس) ٹیکس چوریوں، غبن وحرام کے کاروباروں، ناجائز تجارتوں اور دھوکے کی آمدنیوں کی بھرمار ہے۔ سود پورے معاشرے میں سرطان کی طرح گھر کر گیا ہے اور رَگ وریشے میں پیوستہ ہو گیا ہے اس کی ایک ادنیٰ مثال لیجیے آج ہمارے جسم پر جو لباس ہے اس کا تھوڑا تجزیہ کیجیے کہ کسان نے کپاس کا بیج کھاد اور دوائیاں سود پر لے کر فصل بوئی، جیننگ فیکٹری کے مالک نے سود کی رقم سے فیکٹری لگائی اور سود کی رقم سے فیکٹری چلائی، دھاگہ بنانے والی فیکٹری نے سود کی رقم سے فیکٹری چالو کی، کپڑا بننے والی مل نے سود پر رقم کے ذریعے کارخانہ چلا کر کپڑا تیار کیا۔ ہول سیلر نے کاروبار کے لیے سود لیا اور ریٹیل پر بیچنے والے نے بھی عام طور پر کاروبار کرنے میں بینک کی رقم سے کاروبار کیا پھر یہ کپڑا ہمارے جسم پر آیا اور زیب تن بنا جسے پہن کر ہم عبادتیں اور دعائیں کرتے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ نہ سمجھئے کہ یہ کپڑا قطعی حرام کا ہے، نہیں ایسا نہیں ہے اس میں ہاتھوں کی تبدیلی، عموم البلوی، اضطراری حالت اور ملکیت وکیفیات کی تبدیلی نے اس کی شدت کو کم کر دیا ہے' اس کی قطعی حرمت ختم ہوگئی ہے اور جواز کی گنجائش پیدا ہوگئی ہے' لیکن شبہ کی کیفیت تو ضرور موجود ہے اور روحانی اثرات واقع ہونے کی ممانعت تو موجود ہے اور اعلیٰ تقویٰ کے بہرحال خلاف ہے۔ ان حالات کا تصور کر کے ایک مومن کا دل ضرور کڑھتا ہے اور کڑھنا بھی چاہیے اور اسے سوچنا چاہیے کہ اس ہمہ گیر سودی نظام سے کیسے چھٹکارا حاصل کیا جائے لیکن اکثر لوگوں کے دلوں سے یہ احساس ہی جاتا رہا ہے جو دینی لحاظ سے پریشان

کن حالت ہے اور دینی زندگی سے دُوری کی علامت ہے۔

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر مسلمان کھانا کھاتے وقت اس حقیقت کو سامنے رکھے اور یہ نیت رکھے کہ اللہ تعالیٰ نے پاک رزق کھانے کا جو حکم دیا ہے، میں اس کی تعمیل کر رہا ہوں تا کہ نیک عمل کروں، نفس کا حق ادا کروں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کروں تو یہ شخص اجر و ثواب کا حق دار ہوگا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس حدیث پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا کرے۔ (آمین)

حدیث نمبر 11

بے یقینی سے بچنا

عَنْ أَبِی مُحَمَّدٍ الْحَسَنِ بْنِ عَلِیِّ بْنِ أَبِی طَالِبٍ سِبْطِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَرَیْحَانَتِه رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: حَفِظْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ "دَعْ مَا یَرِیْبُکَ إِلٰی مَالَا یَرِیْبُکَ" رواه الترمذی والنسائی وقال الترمذی: حدیث حسن صحیح.

"ابو محمد حسن بن علیؓ، رسول اللہ ﷺ کے نواسے نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان یاد رکھا ہے "جو بات تمہیں دل میں کھٹکے، اسے چھوڑ دو اور وہ بات اختیار کرو جو تمہیں شک میں مبتلا نہ کرے۔" (ترمذی ونسائی)

تشریح:

یہ حدیث شریف انسان کی زندگی میں پیش آنے والے معاملات (چاہے دینی ہوں یا دنیاوی) کو نمٹانے اور طے کرنے میں بہترین رہنمائی کرتی ہے اس کو حدیث نمبر ۶ سے ملا کر پڑھا جائے اور مطالعہ کیا جائے تو مفہوم اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے، ہم نے وہاں تفصیل سے بیان کیا ہے۔

ایک دوسری حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

لَا یَبْلُغُ الْعَبْدُ اَنْ یَکُوْنَ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ حَتّٰی یَتْرُکَ مَالَا بِهٖ بَأْس" مَخَافَةَ مَابِهٖ بَأْس. (ترمذی)

"بندہ متقین کے درجے کو اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا یہاں تک کہ ان باتوں کو بھی چھوڑ دے جن میں کوئی حرج (نقصان) نہیں ہے، ان باتوں میں مبتلا

ہونے کے ڈر سے جن میں حرج ہے۔"

یعنی ایسی باتوں اور کاموں سے بھی کنارہ کشی کی جائے جو ناجائز اور منع تو نہیں ہیں لیکن یہ ڈر ہے کہ ان کے کرنے سے انسان ایسے کاموں میں مبتلا ہو سکتا ہے جو ممنوعہ اور ناجائز ہیں، زندگی کے تمام معاملات میں اس حدیث پر عمل کرنے سے مسلمان متقین کے درجے میں شامل ہو جاتا ہے۔

اس حدیث میں یہ اصولی بات بیان ہوئی ہے کہ جس کام کے جائز وناجائز ہونے کے دونوں پہلو برابر ہوں اور دل میں ان پر عمل کرنے کے لیے شک پیدا ہو رہا ہو تو پھر اس صورتِ حال سے نکلنے کی آسان راہ یہی ہے کہ ان میں سے وہ پہلو اختیار کرے جس میں شک کم ہے۔ فقیہ کہتے ہیں کہ کسی شخص کو نماز ادا کرتے ہوئے بھول ہو جاتی ہو اور رکعتوں کی گنتی یا سجدوں کی تعداد وغیرہ میں شک ہوتا ہو اور دونوں پہلو برابر ہوں تو ایسے نمازی کو چاہیے کہ کم تعداد پر عمل کرے تاکہ شک کی کیفیت سے نکل کر یقین کی طرف آئے اور دل کو اطمینان حاصل ہو۔

اسی طرح یہ حدیث دنیاوی معاملات وامور میں بھی رہنمائی کرتی ہے لہٰذا کاروبار اور معاملات میں اس پر عمل کیا جائے تو کاروباری معاملات صحیح رُخ اختیار کر لیتے ہیں اور بہتر نتائج نکلتے ہیں جیسے کاروبار کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو میں نفع حاصل ہونے اور اس کے کامیاب ہونے میں شک ہے اسی طرح دوسرے پہلو میں بھی یہی حالت ہے تو اس صورت میں وہ پہلو اختیار کیا جائے جس میں شک کم ہو اور اطمینان کا پہلو غالب ہو تاکہ دل کو تسلی ملے اور انسان بے اطمینانی، تفکرات اور بے آرامی سے بچ جائے۔

بہرحال ہمیں اپنی زندگی کے تمام معاملات چاہے انفرادی ہوں یا اجتماعی، چھوٹے ہوں یا چاہے بڑے، اس حدیث کے مطابق طے کرنے چاہئیں۔

حدیث نمبر 12

فضول باتوں اور کاموں سے اجتناب

عَنْ أَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللهِ مَنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُهُ مَالَا یَعْنِیْهِ. (حدیث حسن رواہ الترمذی)

''حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''انسان کے اسلام کی خوبی اس کا لایعنی (لغو) باتوں سے بچنا ہے۔'' (اس حدیث کو ترمذی اور دوسروں نے روایت کیا ہے)

تشریح:

یہ حدیث جوامع الکلم میں سے ہے اس میں نبی اکرم ﷺ نے مومن کی ایک اہم صفت بیان فرمائی ہے جسے اختیار کرنے سے اس کا اسلام اور ایمان کامل اور عمدہ بن جاتا ہے۔ یہ صفت ہے مومن کا فضول باتوں اور کاموں سے کنارہ کش ہونا اس صفت کو قرآن مجید میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ. (المومنون ۲۳:۳)

''اور جو لوگ لغو باتوں سے دُور رہتے ہیں۔''

لغو ہر اس بات اور کام کو کہتے ہیں جو فضول، بے کار اور لا حاصل ہو، جن باتوں اور کاموں کا دنیا اور آخرت میں کوئی فائدہ نہ ہو، جن سے کوئی مفید نتیجہ نہ نکلے، جن کی کوئی حقیقی ضرورت نہ ہو اور جن سے کوئی اچھا مقصد حاصل نہ ہو۔ مومن وہ شخص ہے جسے ہر وقت اپنی ذمہ داریوں کا احساس رہتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ دنیا دراصل ایک امتحان گاہ ہے اور جس چیز کو زندگانی، عمر اور وقت کے مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ درحقیقت ایک جچی تلی مدت

ہے جو اسے امتحان کے لیے دی گئی ہے، یہ احساس اس کو بالکل اس طالب علم کی طرح سنجیدہ ور مشغول بنا دیتا ہے جو امتحان کے کمرے میں بیٹھا اپنا پرچہ حل کر رہا ہو جس طرح اس لالب علم کو یہ احساس ہوتا ہے کہ امتحان کے یہ چند گھنٹے اس کی آئندہ زندگی کے لیے فیصلہ کن ہیں اور اس احساس کی وجہ سے وہ ان گھنٹوں کا ایک ایک لمحہ اپنے پرچے کو صحیح طریقے سے حل کرنے کی کوشش میں صرف کر ڈالنا چاہتا ہے اور اس کا کوئی سیکنڈ فضول ضائع کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا، ٹھیک اسی طرح مومن بھی دنیا کی زندگی کو انہی کاموں میں صرف کرتا ہے جو انجام کار کے لحاظ سے مفید ہوں حتیٰ کہ لغو اور بے کار باتوں اور کاموں سے بچ جائے گا اور اپنا دین وایمان مکمل کرے گا۔شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

دل ز پر گفتن بمیرد اندر بدن
گرچہ گفتارش بود در عدن

یعنی زیادہ باتیں کرنے سے دل اندر سے مر جاتا ہے اگر چہ وہ باتیں عدن کے موتیوں کی طرح قیمتی کیوں نہ ہوں۔

وہ تفریحات اور کھیلوں میں بھی ان چیزوں کا انتخاب کرتا ہے جو محض تضیع وقت نہ ہوں بلکہ کسی بہتر مقصد کے لیے اسے تیار کرنے والی ہوں۔اس کے نزدیک وقت کاٹنے کی چیز نہیں ہوتی بلکہ استعمال کرنے کی چیز ہوتی ہے۔آخر ایک مومن جو یہ یقین رکھتا ہو:

مَایَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ. (ق۵۰:۱۸)

”وہ کوئی بات نہیں بولتا ہے جس کے لیے اس کے پاس ایک حاضر باش نگران موجود نہ ہو۔“

اور یہ آیت اس کے سامنے موجود ہو تو وہ کس طرح لغو اور لایعنی باتوں میں اپنا وقت گنوائے گا اور عمل کا موقع ضائع کرے گا۔

فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ.

(الزلزال۹۹:۷۔۸)

”جو شخص ذرہ برابر بھی نیکی کرے گا، وہ اسے پائے گا اور جو ذرہ برابر بُرائی کرے گا، وہ اس کو پائے گا۔“

ایسا شخص اپنا وقت کیسے بے ہودہ باتوں، گندے مذاق، ٹھٹھوں اور فقرہ بازیوں میں گنوائے گا' پھر بے کار کھیل کود میں مشغول ہو کر یا بے کار بیٹھ کر اپنی قیمتی گھڑیاں ضائع کرے گا' اس شخص کے لیے ایسی سوسائٹی ایک عذاب ہوتی ہے جس میں کسی وقت بھی اس کے کان گالیوں، غیبتوں، تہمتوں، بہتانوں، جھوٹی باتوں، فحش گانوں اور بے ہودہ گفتگو سے محفوظ نہ ہوں۔

مومن سلامت طبع، پاکیزہ مزاج اور خوش ذوق انسان ہوتا ہے، بے ہودہ باتوں اور لغو کاموں سے اس کی طبیعت میل نہیں رکھتی، وہ مفید باتیں تو کر سکتا ہے مگر بے فائدہ باتوں کے قریب نہیں جاتا، وہ خوش طبعی پاکیزہ مزاح اور سنجیدہ مذاق تو کر سکتا ہے لیکن بے ہودہ مذاق ٹھٹھوں اور بے ہودہ باتوں سے کوسوں دُور بھاگتا ہے۔

امام مالکؒ نے روایت کی کہ لقمان حکیم سے پوچھا گیا کہ آپ اس مرتبے اور مقام پر کن اوصاف کی وجہ سے پہنچے ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا ''سچ بولنے، امانتیں حق داروں تک پہنچانے اور لغو باتوں اور کاموں سے کنارہ کشی کرنے کی وجہ سے پہنچا ہوں۔''

حضرت حسنؓ نے کہا ''کسی بندے سے اللہ تعالیٰ کی توجہ ہٹنے کی نشانی یہ ہے کہ وہ لغو باتوں اور کاموں میں مشغول ہو جاتا ہے۔''

حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ نبی اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ مجھے وصیت فرمائیں اس پر آپ ﷺ نے فرمایا ''میں تجھے اللہ کا خوف اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ تمہارے تمام معاملات کی بنیاد ہے۔'' میں نے عرض کیا کہ ''مجھے مزید ارشاد فرمائیں'' آپ ﷺ نے فرمایا ''اپنے لیے قرآن کریم کی تلاوت کرنا لازم کر لو اور اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرو، وہ تجھے آسمان پر یاد کرے گا'' پھر میں نے مزید فرمانے کی گزارش کی تو آپ ﷺ نے فرمایا ''اپنے اوپر جہاد کرنا لازم کر لو کیونکہ یہ مومنوں کے لیے رہبانیت (ترکِ دنیا) ہے۔'' میں نے کہا کہ ''اور کچھ فرمائیں'' اس پر آپ ﷺ نے فرمایا ''خاموشی اختیار کرو جو تجھ سے شیطان کو دُور کرے گی اور تمہارے دینی معاملات میں تمہاری مددگار ہوگی۔'' میں نے اور فرمانے کی التجا کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''حق بات کہو پھر چاہے کسی کو کڑوی لگے'' میں نے مزید نصیحت کرنے کی گزارش کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ

کے احکام کے بارے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہ کر'' میں نے عرض کیا کہ مزید ارشاد ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''اپنے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرو اگر چہ وہ قطع رحمی کا رویہ اختیار کریں'' میں نے اور مزید فرمانے کی گزارش کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''آدمی کے بُرے ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ اپنے نفس کو بھلا دے اور لغو باتوں اور کاموں میں لگ جائے۔ اے ابوذرؓ! عقل تدبیر جیسی نہیں ہے، کسی کام سے دُور رہنے جیسی تقویٰ نہیں ہے اور کوئی خوبی اور بھلائی حسن اخلاق جیسی نہیں ہے۔''

لغو کاموں اور باتوں سے بچنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہر شخص بات کرنے سے پہلے یہ سوچے کہ جو بات میں کہہ رہا ہوں، وہ غلط تو نہیں ہے، گناہ کی بات تو نہیں ہے، کسی کو تکلیف دینے والی تو نہیں ہے اور بے کار تو نہیں ہے۔ اور یہ کہاوت ہر وقت اپنے سامنے رکھے کہ ''پہلے تول پھر بول''

اسی طرح کوئی کام کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے کہ اس میں دین و دنیا کا کون سا فائدہ ہے؟ کسی کی حق تلفی تو نہیں ہو رہی؟ ان باتوں کو سامنے رکھا جائے تو انسان بہت سی لغو باتوں سے محفوظ رہے گا۔

حدیث نمبر 13

پسند کا پیمانہ

عَنْ أَبِی حَمْزَةَ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍؓ خَادِمِ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ لَا یُؤْمِنُ أَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَایُحِبُّ لِنَفْسِہٖ. (رواہ البخاری ومسلم)

''حضرت انسؓ (خادم رسول اللہ ﷺ) نے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے بھائی کے لیے وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔''

تشریح:

قرآن مجید وحدیث شریف میں مومنوں کی جو اعلیٰ صفات بیان کی گئی ہیں، ان میں سے ایک صفت ان میں باہمی محبت واُلفت کا ہونا ہے۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے ''مومن سراپا محبت واُلفت ہے اس شخص میں کوئی بھلائی نہیں ہے جو نہ کسی سے اُلفت رکھتا ہو اور نہ ہی اس سے کوئی مانوس ہو۔'' (احمد) قرآن مجید میں مومنوں کی شان اس طرح بیان ہوئی ہے ''جو مومنوں پر نرم اور کافروں پر سخت ہوتے ہیں۔'' (المائدہ ۵:۵۴)

سورۃ الفتح میں ہے ''وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحمت وشفقت کرنے والے ہیں۔'' (۴۸:۲۹) مومن کے لیے ضروری ہے کہ اپنے آپ کو مسلم معاشرے کا ایک فرد اور جز شمار کرے اور یہ تصور رکھے کہ معاشرے کی بھلائی اس کی اپنی ذات کی بھلائی ہے اور اس کا نقصان اس کا اپنا نقصان ہے۔ اگر یہ احساس وشعور اس کے مزاج میں پختہ اور راسخ ہو جائے تو پھر معاشرے کے ہر فرد کو وہ اپنا بھائی اور ساتھی سمجھے گا، جو بھلائی اپنے لیے پسند

کرے گا، وہی دوسرے کے لیے بھی چاہے گا اور جو چیز اور جو بات اپنے لیے ناپسند کرے گا، وہ دوسرے کے لیے بھی ناپسند کرے گا اور خود غرضی وحسد سے پاک ہوگا۔

مومنوں کے لیے نرم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مومن ایمان والوں کے مقابلے میں اپنی طاقت ہرگز استعمال نہ کرے۔ اس کی ذہانت، اس کی چالاکی، اس کی قابلیت' اس کا اثر و رسوخ، اس کا مال اور اس کی جسمانی طاقت غرض کہ کوئی بھی چیز مسلمانوں کو دبانے، ستانے اور نقصان پہنچانے کے لیے نہ ہو۔ دوسرے مسلمان اسے اپنے لیے ہمیشہ ایک نرم مزاج، رحم دل، ہمدرد اور حلیم انسان سمجھیں۔ یہی بات اس حدیث میں ارشاد ہوئی ہے ''مومن باہمی طور پر ایک جسم کی طرح ہیں جب اس کے ایک عضو میں تکلیف ہو تو تمام بدن بخار اور بے داری میں مبتلا ہو کر اس کا ساتھ دیتا ہے۔'' (بخاری ومسلم)

محبت کرنے سے مراد ہے خیر و بھلائی چاہنا اور خیر خواہی کرنا جیسا کہ عوامی کہاوت ہے ''میرا بھلا جگ جہاں کا بھلا'' یہ بات نہ صرف زبان سے کہی جائے بلکہ دل میں بھی یہ تصور اور خیال پیدا کیا جائے۔

البتہ یہ محبت اختیاری اور دینی ہے کیونکہ طبعی اور فطری محبت جو اولاد، بیوی اور والدین سے ہوتی ہے، وہ ہر ایک سے کرنا انسان کے بس میں نہیں ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے ''دین خیر خواہی کا نام ہے'' صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا ''مسلمانوں کے رہنماؤں اور ان کے عوام کے ساتھ خیر خواہی کرنا۔'' (مسلم)

یہ ہے اسلامی اخلاق وکردار کا اعلیٰ معیار جو اسلام اپنے ماننے والوں میں پیدا کرتا ہے۔ اس معیار کے اعلیٰ اور کامل نمونے اسلام کے دورِ اوّل یعنی صحابہ کرامؓ اور تابعین میں کثرت سے پائے جاتے ہیں اور انفرادی طور پر یہ نمونے آج تک جاری ہیں جو صالحین، صوفیوں، درویشوں اور نیک لوگوں میں ملتے ہیں۔ تاہم ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے ہر ایک اُمتی اپنے اندر پیدا کرے تاکہ معاشرے میں امن وسلامتی، خیر خواہی، ہمدردی، غم خواری، دلجوئی پیدا ہو اور نفرتیں، کدورتیں، کینہ وحسد اور بدخواہی دُور ہو۔

اس حدیث کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے اس پر ایک اور زاویے سے بھی غور کرنا

ضروری ہے۔ حدیث کا ترجمہ ہے ''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا'' اس میں مومن نہ ہونے کا مطلب کیا ہے؟ اسی حدیث کو ابن حبان نے بھی روایت کیا ہے جس میں ''لا یُؤمِنُ اَحَدُکُمْ'' کے بجائے ''یَبْلُغ الْعَبْدُ حَقِیْقَةَ الْاِیْمَانِ'' کے الفاظ ہیں جس سے واضح ہوتا ہے کہ اس حدیث اور اس جیسی دوسری حدیثوں کا مطلب ایمان کی بالکل غیرموجودگی (قطعی نفی) نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ ہم اپنی گفتگو میں بھی کسی بُرے آدمی کے لیے کہتے ہیں اس میں تو انسانیت ہی نہیں ہے، یہ انسان نہیں ہے، جانور ہے' تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ اچھا انسان نہیں ہے اسی طرح کی کتنی حدیثوں میں ایمان کے نقص اور خامی کے لیے ''لَا یُؤمِنُ'' کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان احادیث کا مقصد مومنوں میں یہ صفات پیدا کرنے کی ترغیب دلانا اور تربیت ونصیحت کرنا ہے جس کے بیان کرنے کا یہی انداز مناسب اور بہتر رہتا ہے۔

حدیث نمبر 14

مسلمانوں کی جان کی حرمت

عَنْ أَبِیْ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ : لَایَحِلُّ دَمُ امْرِءٍ مُسْلِمٍ إِلَّا بِاِحْدٰی ثَلاَثٍ : اَلثَّیِّبُ الزَّانِیْ وَالنَّفْسُ بِالنَّفْسِ، وَالتَّارِکُ لِدِیْنِہِ الْمُفَارِقُ لِلْجَمَاعَةِ. (بخاری ومسلم)

"حضرت ابن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "کسی مسلمان کا خون بہانا حلال نہیں ہے سوائے اس کے کہ وہ تین باتوں میں سے کوئی ایک بات کر بیٹھے۔ شادی شدہ ہوتے ہوئے زنا کرے، کسی کو جان بوجھ کر قتل کرے، اپنا دین (اسلام) چھوڑ کر مسلمانوں کی جماعت سے علیحدہ ہو جائے۔ (یعنی مرتد ہو جائے)

تشریح:

بعض روایات میں لفظ "مسلم" کے بعد یہ عبارت آئی ہے:

یَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاِنِّیْ رَسُوْلَ اللّٰہِ اِلَّا بِاِحْدٰی ثَلاَثٍ.

"وہ گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوائے کوئی معبود نہیں ہے اور میں اللہ کا رسول ہوں مگر تین باتوں میں سے کوئی ایک کر بیٹھے۔"

دراصل یہ عبارت مسلم لفظ کی تفسیر وتشریح ہے اس طرح "المفارق للجماعة" یہ بھی "التارک لدینه" کی تفسیر ہے۔

اسلام میں انسانی جان عام طور پر اور مسلمانوں کی جان خاص طور پر واجب الاحترام ہے یعنی اس کا احترام کرنا لازم ہے۔ چھوٹی موٹی بات اور کسی معمولی سبب کی بناء پر کسی

انسان کو زندگی سے محروم نہیں کیا جا سکتا بلکہ بڑی اہم مجبوری اور ضرورت کی وجہ سے ہی کسی انسان کی جان لی جا سکتی ہے۔ قرآن مجید اور حدیث شریف میں کتنے ہی مقامات پر قتل اور خون ریزی کی مذمت اور اس پر عذاب کا بیان آیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ. (بنی اسرائیل ۱۷:۳۳)

''قتل نفس کا ارتکاب نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ''

اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا. (النساء ۴:۹۳)

''جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی جزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لیے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے۔''

ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

''جب دو مسلمان ہتھیاروں کے ساتھ باہم لڑیں تو قاتل اور مقتول دونوں دوزخ میں جائیں گے'' اس پر حدیث کے راوی نے کہا ''یا رسول اللہ! ﷺ اس قاتل کی بات تو سمجھ میں آتی ہے لیکن مقتول کے ساتھ یہ معاملہ کیوں ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا ''وہ اپنے مدمقابل کے قتل کرنے کا حریص تھا''

(بخاری)

ایک اور حدیث میں ہے ''اگر ساری دنیا کے انسان مل کر کسی مومن کو قتل کریں تو اس پر خداوند کریم ان تمام کو منہ کے بل دوزخ میں ڈالے گا۔''

انسان کا قتل کبیرہ گناہوں میں سے ہے اس میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کو تلف کرنا شامل ہے۔ اس لیے جب تک اللہ تعالیٰ اور مقتول کے وارثوں سے معاف نہیں کرایا جائے گا اس وقت تک بخشش اور نجات نہیں ہوگی۔

اس حدیث کو حدیث نمبر ۸ سے ملا کر مطالعہ کیا جائے تو دونوں حدیثیں اچھی طرح سمجھ میں آئیں گی اور یہ حدیث آٹھویں حدیث کے فقرے الا بحق الاسلام کی تفسیر ہوگی۔

اسلام دینِ فطرت اور معتدل (افراط وتفریط سے پاک) دین ہے، سزاؤں کے بارے میں بھی اس کے احکام اعتدال وانصاف پر مبنی ہیں۔ یہ نہ تو آج کے ماڈرن دور کے دانش وروں کی طرح موت کی سزا کو بالکل حرام قرار دیتا ہے اور نہ ہی جاہلیت کے دور کی طرح جھوٹی موٹی اور معمولی قصور پر بادشاہوں، نوابوں، رئیسوں، خانوں اور سفاک انسانوں کی خواہشوں پر انسان کے قتل کا طریقہ اختیار کرتا ہے بلکہ یہ انسانیت کی بھلائی، بہتری، امن وسلامتی، انسانوں کی عزتوں اور عصمتوں کے تحفظ اور دین اور عقیدے کی حفاظت کے لیے سخت مجبوری کی حالت میں قتل کی اجازت دیتا ہے اور یہ اس لیے ہے کہ دنیا میں امن وامان قائم رہے، انسان زور وجبر، ظلم وزیادتی اور خوف وخطرے کے بغیر زندگی گزارے اور ہر شخص کی عزت وآبرو اور جان ومال سلامت رہے۔ اگر کوئی بدبخت، ظالم اور سماج دشمن پُرامن حالتوں کو بگاڑنے کی کوشش کرے یا بگاڑ دے تو اسے اسلامی سماج میں رہنے کا حق نہیں ہے اور اسے الا بحق الاسلام کے تحت سزائے موت دی جائے گی۔

اس حدیث میں قتل نفس (انسانی) کی تین جائز صورتیں بتائی گئیں ہیں:

''ایک یہ کہ آدمی شادی شدہ ہو جسے اپنی نفسانی خواہش پوری کرنے کا موقع حاصل ہو پھر بھی زنا جیسی بدکاری کرے تو ایسے شخص کو رجم کیا جائے گا۔ رجم کے ثبوت کے دلائل اور احکام بڑی کتابوں اور اسلامی فقہ (قانون) میں موجود ہیں۔

دوسری صورت میں خون کا بدلہ خون ہے یعنی کوئی شخص کسی اسلامی حکومت کے شہری کو عمداً (جان بوجھ کر) قتل کر دے تو اسے قصاص (بدلے) میں حکومت کے ذریعے مقتول کے ورثاء کی مرضی سے قتل کیا جائے گا اس قتل کی اہمیت بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ.

(البقرہ۲:۱۷۹)

''عقل وخرد رکھنے والو! تمہارے لیے قصاص (بدلہ لینے) میں زندگی ہے تاکہ تم اس قانون کی خلاف ورزی سے بچ جاؤ۔''

قصاص کی حکمت اہمیت اور اس کے احکام بڑی کتابوں میں ملاحظہ کیجیے۔ معلوم ہو کہ آج کی جدید دنیا پھر موت کی سزا کی طرف رجوع کر رہی ہے، کتنے ہی ترقی یافتہ ممالک جیسے کہ امریکہ، فرانس، جرمنی اور چین وغیرہ نے موت کی سزا کو بحال کر دیا ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص دینِ اسلام بخوشی قبول کرے یا ورثے میں یہ نعمت پائے اور پھر کفر اختیار کر لے یعنی مسلمان ہو کر اس سے نکل جائے، مرتد ہو جائے، ایسے شخص کو قید کر دیا جائے گا اور اسلام لانے کی دوبارہ پیش کش کی جائے گی اگر یہ شخص توبہ کر کے پھر سے اسلام قبول کر لے تو بہت اچھا ورنہ اسے قتل کر دیا جائے گا لیکن یہ سارا عمل اسلامی حکومت کا ہے، کسی فرد، جماعت، گروہ یا غیر حکومتی ادارے کو اس کی اجازت نہیں ہے۔''

اس کے علاوہ دو سبب اور بھی ہیں جن کی وجہ سے انسان قتل کا سزاوار بن جاتا ہے۔ ایک یہ کہ قائم اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت کر کے ہتھیار اُٹھا لے اور اسلامی نظام کو تہس نہس کرنے کی کوشش کرے تو اسے قتل کیا جائے گا۔ سورۃ المائدہ آیت ۳۳ میں ارشاد ہے:

اِنَّمَا جَزَآءُ الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ...... عَذَابٌ عَظِيْمٌ. (المائدہ۵:۳۳)

''اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لیے تگ ودو کرتے ہیں تاکہ فساد برپا کریں، ان کی سزا یہ ہے کہ یہ قتل کیے جائیں یا سولی پر چڑھا دیئے جائیں یا ان کے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پیر کاٹے جائیں یا انہیں جلاوطن کر دیا جائے۔ یہ ذلت اور رسوائی تو ان کے لیے دنیا میں ہے اور آخرت میں ان کے لیے اس سے بڑی سزا ہے۔''

دوسرا یہ ہے کہ بعض لوگ اسلام کی اشاعت، اسلامی نظام کے قیام اور دعوت وتبلیغ میں رکاوٹ ڈالیں اور مسلمانوں اور اسلامی حکومت سے جنگ کریں تو ایسے اشخاص سے کفار محارب کی طرح اقدام کیا جائے گا اور ان سے جہاد کیا جائے گا۔ جہاد، قتال اور غزوات کا قانون اسی اصول پر مبنی ہے۔ ان پانچ صورتوں کے علاوہ انسان کے قتل کا کوئی اور سبب نہیں ہے البتہ ایک امکانی صورت یہ ہے کہ کوئی آدمی کسی مسلمان کی جان، مال اور عزت پر حملہ کرے تو ایسے حملہ آور کو دفاع کے طور پر قتل کیا جا سکتا ہے لیکن یہ صورت عارضی

اور وقتی نوعیت کی ہے۔

اوپر بیان کردہ پانچوں صورتوں میں قتل کے تمام معاملات یعنی اس قانون کے نفاذ تحقیق وتفتیش، شہادتیں لینے اور دیگر متعلقہ امور طے کرنے، سرانجام دینے اور فیصلہ کرنے کا اختیار صرف اور صرف اسلامی حکومت کو حاصل ہے۔ انفرادی طور پر کسی صورت میں کسی انسان کی جان نہیں لی جاسکتی اور نہ ہی اس قانون پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ ماورائے عدالت کسی کو قتل کا فیصلہ کرنے، فیصلہ دینے اور قتل کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

ان باتوں کی روشنی میں آج ہم اپنے مسلم معاشرے کا جائزہ لیں تو قتل وخون ریزی غیر مسلم معاشروں سے زیادہ دکھائی دیتی ہے اور اس سے بھی زیادہ افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ جو دین انسانی جان کا احترام وحفاظت پر اتنا زور دیتا ہے اور اسے تحفظ فراہم کرتا ہے اس کے نام پر انسانوں کا ناحق خون بہایا جاتا ہے اور اپنی دنیا وآخرت برباد کی جاتی ہے۔

حدیث نمبر 15

مومن کی صفات

عن ابی ھریرہ ان رسول اللّٰہ قال: من کان یؤمن باللّٰہ والیوم الاٰخر فلیقل خیرا اولیصمت، ومن کان یؤمن باللّٰہ والیوم الاٰخر فلیکرم جارہ ومن کان یؤمن باللّٰہ والیوم الاٰخر فلیکرم ضیفہ۔"

(رواہ البخاری ومسلم)

''حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ بھلی بات کہے یا خاموش رہے جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ اپنے پڑوسی کا احترام کرے اور جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ اپنے مہمان کا اکرام کرے۔''

تشریح:

بعض علماء کا کہنا ہے کہ ادب و اخلاق حسنہ کی تمام باتیں جن چار احادیث سے نکلتی ہیں، ان میں سے ایک یہ حدیث ہے' پھر بعض کا قول ہے کہ اس حدیث کا ابتدائی حصہ ''بھلی بات کرے یا خاموش رہے'' جوامع الکلم میں سے ہے۔

حدیث شریف میں جو تین باتیں بیان ہوئی ہیں، وہ ایسی ہیں کہ ان سے ہر انسان کو روزانہ بلکہ ہر گھڑی سابقہ پیش آتا ہے۔ ہم میں سے کون ایسا ہے جس کے پڑوسی نہ ہوں، کون ایسا ہے کہ جس کے ہاں کوئی مہمان نہ آئے یا وہ کسی کے ہاں مہمان بن کر نہ جائے اور گفتگو سے سابقہ تو ہر انسان کو پیش آتا ہی ہے' اس لیے ہمیں اپنی روزمرہ کی زندگی میں اس

حدیث کو سامنے رکھنا چاہیے تاکہ ایک کامل مومن کی سی زندگی گزاریں۔ حدیث کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام ایمان کی تکمیل کا تقاضا ہیں یعنی ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ یہ کام ہونے چاہئیں' یہ اعمال انسان کو معاشرے میں ہر دل عزیز، ملنسار اور پسندیدہ بناتے ہیں' جس شخص کے پڑوسی اس سے خوش ہوں، جس کے پاس آئے گئے کو عزت ملے اور جس کی گفتگو حکمت بھری، پیار ومحبت سے لبریز اور شیریں ودل نواز ہو تو اس شخص کی ہر ایک عزت کرے گا' اس کی باتیں سنے گا اور اس کے ہر دُکھ سکھ میں کام آئے گا اور ایسے شخص کی زندگی خوش گوار اور پُرسکون اور اطمینان سے گزرے گی۔ تینوں باتوں کا مختصر سا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

زبان کی اہمیت:

(الف) حدیث زیرِ مطالعہ میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

فَلْيَقُلْ خَيْرًا اَوْ لِيَصْمُتْ.

''یعنی بھلی بات کہے یا خاموش رہے۔''

یہ ٹکڑا جوامع الکلم میں سے ہے۔ انسان کی زبان سے جو بات نکلتی ہے، وہ بذاتِ خود یا انجام کے لحاظ سے اچھی یا بُری ہوتی ہے اس لیے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''آدمی زبان سے جو کلمہ بولے، بھلائی کا بولے یا خاموش بیٹھے''۔ علماء کہتے ہیں ''آدمی کی نیکی یا بدی اس کی زبان کے کنارے میں ہے سو اگر کوئی اسے نیکی کے کاموں میں استعمال کرے گا تو اس کی شان بڑھائے گی لیکن اگر آزاد چھوڑ دے گا تو وہ اسے گڑھے میں گرا دے گی''

سندھی زبان کی کہاوت ہے ''زبان انسان کو زمین پر بٹھاتی یا تخت پر بٹھاتی ہے۔''

امام شافعیؒ اس حدیث کا مطلب بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص بات کرنے کا ارادہ کرے تو پہلے اپنی بات اور گفتگو کے بارے میں سوچے اور دیکھے کہ اس میں اس کے لیے کوئی نقصان تو نہیں ہے پھر بات کرے لیکن اگر اس میں نقصان کا کوئی پہلو یا شک کا پہلو ہے تو اس سے رُک جائے۔ ''حلیة العلماء'' میں ہے کہ آدمی اتنی ہی بات زبان سے نکالے جتنی ضرورت ہے جس طرح اپنے مال سے اتنا ہی خرچ کرتا ہے، جتنی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کتاب میں نبی ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ عافیت وسلامتی کے دس حصے ہیں، ان میں سے نو حصے اللہ تعالیٰ کے ذکر کے سوا خاموش رہنے میں ہیں۔ کسی عارف سے پوچھا گیا

کہ ''آپ نے خاموشی اختیار کیوں کی ہے؟'' انہوں نے جواب دیا کہ ''مجھے خاموش رہنے میں کبھی بھی پریشانی اور افسوس نہیں ہوا جبکہ گفتگو کرنے پر کتنی مرتبہ نادم اور پشیمان ہوا ہوں'' یہ بھی کہا گیا کہ زبان باولے کتے کی طرح ہے، اسے آزاد چھوڑ دو گے تو کاٹے گی۔

حضرت علیؓ کے زبان کے بارے میں اشعار ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے:

''کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان زبان کے پھسلنے سے موت کے منہ میں چلا جاتا ہے جب کہ پیر کے پھسلنے سے مرتا نہیں ہے اور زبان کا بول گردن کٹواتا ہے جبکہ پیر پھسلنے کا زخم بھر جاتا ہے۔''

(ب) پڑوسی کے حقوق:

حقوق العباد (بندوں کے حقوق) میں سے جن کے حقوق اہم اور زیادہ ہیں، ان میں سے ایک پڑوسی ہے۔ اسلامی اور معاشرتی نقطہ نگاہ سے پڑوسی کے مفہوم اور دائرے میں کافی وسعت ہے۔ خود اس حدیث میں لفظ جار آیا ہے جس سے علماء نے ہر قسم کا پڑوسی مراد لیا ہے یعنی مسلمان، کافر، نیک و بد، دوست و دشمن، عزیز و قریب اور بے گانہ اور گھر کے متصل رہنے والا یا دُور رہنے والا سب شامل ہیں' البتہ ان کے حقوق میں بعض تعلقات کی وجہ سے تھوڑا بہت فرق ضرور ہے' لیکن سب کے حقوق ایک دوسرے پر لازم ہیں' جیسے کسی کا ایک پڑوسی مسلمان اور رشتہ دار ہے تو اس کے سہ گانہ (تین طرح کے) حقوق ہیں۔ ایک پڑوسی ہونے کا، دوسرے مسلمان ہونے کا اور تیسرے رشتہ دار ہونے کا۔ پڑوسی کے معنی اور دائرے میں جو وسعت ہے اس کی طرف آیتِ کریمہ سے ارشاد ملتا ہے:

''رشتہ دار پڑوسی، اجنبی پڑوسی اور پہلو کے ساتھ والے سے حسن سلوک کرو۔''

(النساء۴:۳۶)

آیت میں صاحب بالجنب کے الفاظ ہیں اِس سے مراد ہر وہ ساتھی ہے جو کسی وقت بھی چند ساعتوں کے لیے آپ کے ساتھ رہے جیسے سفر میں ایک سیٹ پر برابر میں بیٹھا ہوا شخص، دُکان پر سودا خریدتے وقت ساتھ کھڑا ہوا فرد اور دفتر میں ساتھ کام کرنے والا ساتھی وغیرہ۔ ان سب عارضی پڑوسیوں کے بھی حقوق ہیں، پڑوسیوں کے حقوق کی اہمیت کا اندازہ نبی ﷺ کے اس ارشاد سے ہوتا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے روایت کی کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

”جبرائیل علیہ السلام مجھے پڑوسیوں سے حسن سلوک کی تاکید مسلسل کرتے رہے حتیٰ کہ میں نے سمجھا کہ پڑوسی کو میراث میں شریک کردیں گے۔“ (متفق علیہ)

اس تاکید کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ جس شخص کے پڑوسیوں سے تعلقات اچھے ہوں گے اس کی زندگی اطمینان اور سکون سے گزرے گی لیکن جس کی پڑوسیوں سے ناسازی ہوگی تو وہ شخص ہروقت آزار میں مبتلا ہوگا۔ رہائشی لحاظ سے پڑوسیوں کا دائرہ کتنا ہے اور اس میں کتنے گھر شامل ہیں؟ اس بارے میں مختلف اقوال ہیں لیکن عام طور پر چالیس مکان پڑوس میں شمار ہوتے ہیں یعنی چاروں طرف سے دس دس مکان۔ تاہم جو مکانات بالکل متصل اور دروازے کے سامنے ہیں، ان کے حقوق مقدم ہیں۔ پڑوسیوں سے اچھے تعلقات رکھنے اور ان کے حقوق ادا کرنے کے بارے میں چند باتیں ذیل میں دی جارہی ہیں:

(۱) پڑوسیوں کو وقتاً فوقتاً چھوٹا بڑا ہدیہ دینا۔
(۲) وہ کوئی مالی یا اخلاقی مدد مانگیں تو وہ کرنا۔
(۳) کسی چیز کی انہیں ضرورت ہو تو وہ دینا۔
(۴) قرض مانگیں تو وہ دینا۔
(۵) بیمار ہوجائیں تو ان کی عیادت کرنا۔
(۶) ان کی خوشی کے موقع میں شرکت کرنا اور مبارک باد دینا۔
(۷) انہیں کوئی دُکھ یا تکلیف پہنچے تو تعزیت اور اظہارِ افسوس کرنا۔
(۸) ان کے رازوں کی حفاظت کرنا۔
(۹) ان کی بھلائی کے لیے سوچنا اور اچھا مشورہ دینا۔
(۱۰) ان کو تکلیف اور دُکھ دینے سے بچنا۔

(ج) مہمان نوازی:

مہمان نوازی اسلامی تہذیب وتمدن اور ثقافت کا ایک امتیازی وصف ہے جس کے بارے میں قرآن مجید اور حدیث شریف میں واضح ہدایات دی گئی ہیں اور میزبان ومہمان کے احکام وآداب بیان کیے گئے ہیں اس طرح یہ ہماری مشرقی تہذیب وثقافت میں بھی لازمی عنصر کی حیثیت سے شامل ہے۔ اگرچہ مغربی تہذیب کی یلغار سے اور ہوٹلوں، موٹلوں،

گیسٹ ہاؤس کی کثرت سے آہستہ آہستہ یہ وصف اور خوبی ختم ہوتی جارہی ہے۔

حدیث میں ضیف کا کلمہ آیا ہے جو ہر قسم کے مہمان کے لیے عام ہے یعنی مسلم وکافر، امیر وغریب، واقف وغیر واقف اور اپنے پرائے سب کو شامل ہے۔ دینی نقطہ نظر سے کافر کو مہمان بنانے میں ایک بھلائی کا پہلو یہ بھی ہے کہ وہ آپ کا مہمان بن کر دینِ اسلام کے بارے میں آپ سے کچھ سنے اور آپ کے اخلاق وکردار کو دیکھ کر اسلام کے قریب آ جائے اور مسلمان ہو جائے۔ سورۂ توبہ آیت ٦ میں ارشاد ہے:

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ. (توبہ۹:۶)

''اور اگر مشرکوں میں سے کوئی شخص آپ کی پناہ لینا چاہے تو اسے پناہ دو تاکہ وہ اللہ کا کلام سنے پھر اسے اس کی امن کی جگہ پر پہنچا دو، یہ معاملہ اس لیے کرنا چاہیے کہ وہ لوگ علم نہیں رکھتے۔''

اس ارشاد کے مطابق کافر، مشرک اور اجنبی کی میز بانی اسلام پہنچانے کی نیت سے کی جائے تاکہ وہ آپ کا نمک کھا کر دین وایمان کے قریب آئے۔ بعض اوقات ایسی میز بانی بڑے اجر وثواب کا باعث بن جاتی ہے۔

اس حدیث کے موجب بعض علماء نے مہمان کی ایک دن کی میز بانی کرنے کو مسلمانوں پر واجب کفایہ کہا ہے' البتہ اس بات پر تمام علماء کا اتفاق ہے کہ یہ اعلیٰ اخلاق میں سے ضرور ہے۔ اجر وثواب کی نیت سے مہمانی کرنا عبادت اور ثواب ہے، مہمان کو صرف کھانا دینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کی عزت واحترام کرنا بھی ضروری ہے۔

مہمان کے چند حقوق ذیل میں دیئے جارہے ہیں:

(۱) خوش خلقی اور کشادہ روئی سے مہمان کا استقبال کرنا، خوش آمدید کہنا اور خیر وعافیت معلوم کرنا۔

(۲) اس کے آنے پر خوشی اور بشاشت ظاہر کرنا۔

(۳) حسب توفیق کھانے اور رہائش کا بندوبست کرنا۔

(۴) اس کے آرام وراحت کا سامان مہیا کرنا۔

(۵) مہمان کی مجلس میں ایسی گفتگو اور بات چیت کرنا کہ جس سے مجلس میں خوش طبعی کا سماں رہے اور ایسی گفتگو نہ کرنا جس سے ماحول میں تلخی پیدا ہو جائے۔

نبی ﷺ بذاتِ خود مہمانوں کی خاطر تواضع کرتے تھے، ان کی خدمت کرتے اور اس میں کافر و مسلم کا فرق نہیں کرتے بلکہ ہر قسم کے مہمان کی مہمانی کرتے تھے۔

حدیث نمبر 16

غصہ پینا

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ "أَنَّ رَجُلاً قَالَ لِلنَّبِیِّ ﷺ : أَوْصِنِیْ، قَالَ لَا تَغْضَبْ، فَرَدَّدَ مِرَارًا، قَالَ لَا تَغْضَبْ. (رواہ البخاری)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ''ایک شخص نے نبی ﷺ سے عرض کیا کہ مجھے آپ نصیحت فرمائیں'' اس پر آپ ﷺ نے فرمایا ''غصہ نہ کیا کرو'' اس شخص نے یہ بات کئی مرتبہ دہرا کر پوچھی تو جواب میں آپ ﷺ یہی فرماتے رہے ''غصہ نہ کیا کرو۔''

تشریح:

قرآن وحدیث کے مطالعے اور انسانی نفسیات کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ غص انسان کی فطری اور طبعی خصلت ہے، ہر انسان کو کم یا زیادہ غصہ ضرور آتا ہے۔ چنانچہ ترمذی میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضورِ اکرم ﷺ نے عصر کی نماز کے بعد صحابہ کرامؓ کو کچھ نصیحتیں فرمائیں، ان میں سے ایک یہ تھی ''آدم علیہ السلام کی اولاد کو کتنے ہی طبقات میں پیدا کیا گیا ہے، ان میں سے کوئی ایسا ہے جسے غصہ دیر سے آتا ہے اور جلدی اُتر جاتا ہے، کسی کو جلدی آتا ہے اور جلدی ہی اُتر جاتا ہے، ان دونوں صورتوں میں ایک بات کی تلافی دوسری بات سے ہو جاتی ہے۔ کوئی ایسا ہے کہ جسے غصہ جلدی آتا ہے اور دیر سے اُترتا ہے۔

ان میں سے بہترین شخص وہ ہے جسے غصہ دیر سے آئے اور جلدی اُتر جائے اور ان میں بُرا وہ ہے جسے غصہ جلدی آئے اور دیر سے اُترے۔ سنو! غصہ انسان کے دل کی ایک

چنگاری ہے، تم دیکھتے نہیں کہ غصے کے وقت اس کی آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں اور رگیں پھول جاتی ہیں پس جسے جونہی غصے کا احساس ہو تو زمین سے چمٹ جائے، کھڑا ہے تو بیٹھ جائے اور بیٹھا ہے تو لیٹ جائے۔ (مشکوٰۃ)

غضب و غصے کو آزاد چھوڑ دینا اور اس میں بے اعتدالی برتنا بہت بڑی بُرائی ہے جس کی وجہ سے انسان گالم گلوچ، مار پیٹ، ظلم و زیادتی اور بے دردی و بے رحمی اور کتنے ہی ایسے کام کر بیٹھتا ہے جن پر بعد میں اسے نادم و پشیمان ہونا پڑتا ہے اور کبھی تو یہ ساری عمر کے لیے ایسے داغ اور ناسور بن جاتے ہیں کہ ان پر کفِ افسوس ملنے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' اسی لیے شریعتِ مطہرہ نے غصے کے وجود کو تسلیم کر کے اسے فرو کرنے اور دبانے کے لیے کتنی ہی ایسی راہیں بتائی ہیں جن پر عمل کرنے سے انسان اس کی تباہ کاریوں سے بچ جاتا ہے' لہٰذا مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنا غصہ ضبط کریں اور معقول سبب کے سوا غصہ ظاہر نہ کریں۔

غصہ دبانے والوں کی تعریف کرتے ہوئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ. (آل عمران ۳:۱۳۴)

''(نیکوکاروں کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ) یہ غصہ دبانے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں۔''

ایک اور مقام پر فرمایا گیا:

وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ. (الشوریٰ ۴۲:۳۷)

''اور جب انہیں غصہ آتا ہے تو وہ معاف کر دیتے ہیں۔''

دونوں آیتوں میں غصہ پینے کے ساتھ معاف کرنے کے لیے بھی کہا گیا ہے۔ انسان کے لیے عام حالات میں معاف کرنا آسان ہے لیکن غصے کی حالت میں معاف کرنا بڑا مشکل عمل ہے' لہٰذا مسلمان کی خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ وہ غصہ کی حالت میں بھی اپنے اوپر ضبط کرے اور معاف کر دے۔ شاعر نے خوب کہا ہے: ؎

ظفر آدمی اس کو نہ جانیئے گا ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

نبی کریم ﷺ نے ایک موقع پر صحابہ کرامؓ سے پوچھا کہ ''پہلوان کون ہے؟'' انہوں

نے عرض کیا کہ ''جو کشتی میں دوسرے کو پچھاڑ دے'' اس پر آپ ﷺ نے فرمایا ''پہلوان وہ نہیں جو دوسرے کو پچھاڑ دے بلکہ وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔''

غصہ دبانے کا کتنا اجر اور بدلہ ہے اس کا اندازہ اس حدیث سے کیجیے:

''ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور عرض کیا ''یارسول اللہ! ﷺ مجھے ایسی بات کی تعلیم دیں جو مجھے بہشت سے قریب اور دوزخ سے دُور کر دے'' آپ ﷺ نے فرمایا ''غصہ نہ کرو، تمہارے لیے بہشت ہے۔'' (مشکوٰۃ)

حدیث زیرِ مطالعہ میں ''لاتغضب'' کا کلمہ آیا ہے۔ علمائے کرام نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ غصے کے وقت آدمی اپنے آپ کو قابو میں رکھے، غصے کو دبانے کی کوشش کرے، اس دوران کوئی جذباتی فیصلہ نہ کرے اور کوئی ناجائز اور غلط قدم نہ اُٹھائے۔ ان باتوں سے قرآن وحدیث میں غصہ دبانے کے متعلق آمدہ احکام پر عمل ہو جائے گا اور آدمی غصے کے نقصانات سے بچ جائے گا۔

غصہ کے بارے میں یہ کہنا اور تصور رکھنا کہ غصہ بالکل نہ آئے، انسانی فطرت، اس کی طبیعت اور عقل کے خلاف ہے۔ کبھی کبھار غصہ کرنا جائز بلکہ ضروری بھی ہوتا ہے جیسے کسی دینی واخلاقی حکم کی خلاف ورزی کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو پامال کرنے والے پر مومن کو جو غصہ آتا ہے، وہ جائز ہے اور دینی غیرت وحمیت کی علامت ہے۔ علماء نے اسے ایمانی جذبے اور غیرت کا نام دیا ہے اس نوع کے غصے کی مثالیں ہمیں حضور ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی زندگیوں میں بھی ملتی ہیں۔

غصے کو دبانے کے لیے نبی کریم ﷺ نے دو علاج تجویز کیے ہیں: ایک روحانی اور دوسرا ظاہری اور حسی، انہیں ملحوظ رکھ کر غصے پر قابو پایا جائے۔

روحانی علاج جس کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے چونکہ غصہ شیطان کی اُکساہٹ سے بھی ہوتا ہے لہٰذا جب غصہ آئے تو شیطان سے بھاگ کر اللہ کی پناہ میں آنا چاہیے یعنی اَعُوذُ بِاللہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم کہنا چاہیے یہ شعور واحساس سے ہوگا تو ضرور غصہ فرو ہو جائے گا اور انسان اعتدال پر آجائے گا۔

مادی اور حسی علاج میں سے ایک وہ ہے جو حضرت ابوذر غفاریؓ نے نبی ﷺ سے

بیان کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے اور وہ کھڑا ہو تو بیٹھ جائے اگر اس سے غصہ ٹھنڈا ہو جائے تو ٹھیک ہے ورنہ لیٹ جائے'' (احمد و ترمذی) اس طرح اس کی ہیئت بدل جائے گی، طبیعت میں تبدیلی آئے گی اور غصہ اُتر جائے گا۔

دوسرا علاج آپ ﷺ نے فرمایا ''غصہ شیطانی عمل ہے اور شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آگ کو پانی بجھاتا ہے سو تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو ایک دَم وضو کرلے۔'' (مشکوٰۃ) چونکہ غصے کی حالت میں خون کا دورہ تیز ہو جاتا ہے، آنکھیں اور چہرہ سرخ ہو جاتے ہیں اور بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے اس لیے ایسی حالت میں وضو سے طبیعت میں برودت (ٹھنڈک) آئے گی اور غصے کی گرمی دُور ہو جائے گی۔

طیش کی حالت میں جس بات پر غصہ آیا ہے اس پر غور کرنا چاہیے' اس سلسلے میں ایک روایت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حضرت یحییٰ بن زکریا علیہ السلام سے کہا کہ ''میں تمہیں ایک ایسا مفید علم سکھلاؤں جس سے غصہ نہیں چڑھے گا'' اس پر حضرت یحییٰ علیہ السلام نے کہا کہ ''یہ کیسے ہوسکتا ہے مجھے غصہ نہ آئے؟'' انہوں نے کہا کہ ''اگر تمہیں ایسی بات کہی جائے جو واقعی تمہارے اندر ہے تو تم خیال کرو کہ اس نے مجھے میرا عیب اور گناہ یاد دلایا ہے، میں اس کی اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتا ہوں اور اگر ایسی بات کہی جائے جو تجھ میں نہیں ہے تو تم الحمد للہ کہو اس لیے کہ یہ بات تم میں نہیں ہے اور اس جھوٹے الزام پر تمہاری نیکیوں میں اضافہ ہوا ہے۔''

لقمان حکیم نے آدمی کو سچائی اور انصاف جانچنے کا طریقہ بتاتے ہوئے اپنے بیٹے سے کہا ''اگر تم کسی سے دوستی قائم کرنا چاہتے ہو تو اسے غصہ دلا کر دیکھو اگر وہ غصے کی حالت میں تم سے انصاف کرتا ہے تو وہ انسان کھرا ہے لیکن اگر انصاف نہ کرے اور اپنے اوپر ضبط نہ رکھ سکے تو اس سے کنارہ کشی اختیار کرو۔''

آج کا دور نفسیاتی وذہنی اُلجھنوں کا دور ہے اس میں لوگوں کو غصہ زیادہ آتا ہے اور معمولی باتوں پر جذباتی ہو کر بھڑک اُٹھتے ہیں' لہٰذا ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے غصے کے بارے میں اللہ اور رسول ﷺ کی تعلیم کو سامنے رکھنا چاہیے تاکہ انفرادی اور اجتماعی نقصانات سے بچا جا سکے اور زندگی خوش گوار اور امن وسکون سے گزرے۔

حدیث نمبر 17

کام سلیقے سے کرنا

عَنْ أَبِيْ يَعْلٰى شَدَّادِ بْنِ اَوْسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنْ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ قَالَ: ''اِنَّ اللهَ كَتَبَ الْاِحْسَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ فَاِذَا قَتَلْتُمْ فَاَحْسِنُوْا الْقِتْلَةَ وَاِذَا ذَبَحْتُمْ فَاَحْسِنُوْا الذِّبْحَةَ وَلْيُحِدَّ اَحَدُكُمْ شَفْرَتَهُ وَلْيُرِحْ ذَبِيْحَتَهُ. (رواہ مسلم)

''حضرت ابو یعلی شداد بن اوسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ہر کام خوش اسلوبی سے کرنے کا حکم دیا ہے لہٰذا جب کسی کو (کسی جائز سبب سے) قتل کرو تو اچھے طریقے سے قتل کرو اور جب جانور کو ذبح کرو تو اچھے طریقے سے ذبح کرو اور تمہیں چاہیے کہ چھری کو تیز کرلو اور ذبح ہونے والے جانور کو راحت پہنچاؤ۔'' (مسلم)

تشریح:

یہ حدیث ان جامع اور اصولی حدیثوں میں سے ہے جس میں اسلام کی ایک اصولی بات بتائی گئی ہے وہ یہ کہ مسلمان جو بھی کام کرے یا جو بھی بات کہے تو اس میں خوبی و بہتری اور سلیقے کا لحاظ رکھے، ایسا انداز، سلیقہ، اسلوب اختیار کرے جو بھلا اور بہترین ہو جس سے اس کے سرانجام دینے والے کی سنجیدگی اور سلیقہ مندی ظاہر ہوتی ہو اور اس کے عمل کا اثر معمول پر اچھا اور بہتر واقع ہو۔

یہ ہدایت زندگی کے تمام معاملات اور امور سے تعلق رکھتی ہے، چاہے معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا، اس کا انفرادی زندگی سے واسطہ ہو یا اجتماعی زندگی سے تعلق ہو، دینی ہو یا دنیاوی، ان

سب میں احسان (اچھے اسلوب) کا لحاظ رکھا جائے پھر انسان کا واسطہ کسی انسان سے ہو یا کسی جانور سے بلکہ پتھر یا لکڑی کا بھی کام ہو تو سلیقے کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

خوش اسلوبی اور سلیقے کا کوئی ایسا لگا بندھا قاعدہ مقرر نہیں ہے جو بیان کیا جائے بلکہ نبی کریم ﷺ نے ایک اصول بتا کر اور ایک دو مثالیں دے کر مزید تفصیل وتشریح آدمی کے اپنے ذوق وبصیرت پر چھوڑ دی ہے یعنی وہ جو کام کرے، اسے اس اصول کے مطابق اپنی بصیرت، رائے اور ذوق سے مزین کر کے سرانجام دے۔ حضورِ اکرم ﷺ نے یہ دو مثالیں نمونے کے طور پر دی ہیں۔ ایک یہ کہ جب کسی انسان کو قتل کیا جائے تو اس میں بھی اس بات کا لحاظ رکھا جائے کہ وہ فیصلہ اس طور پر نافذ جاری ہو کہ مقتول کو زیادہ تکلیف وایذا نہ ہو اور اس کی جلد موت واقع ہو جائے۔

دوسری مثال آپ ﷺ نے جانور کو ذبح کرنے کی دی اور اس کی تھوڑی تفصیل بھی بیان کر دی کہ چھری تیز استعمال کی جائے اور ذبح ہونے والے جانور کو راحت پہنچائی جائے، راحت پہنچانے کی کئی صورتیں ہیں جیسے چھری اس کی آنکھوں کے سامنے تیز نہ کی جائے، کسی دوسرے جانور کے سامنے اسے ذبح نہ کیا جائے، بھوکا پیاسا رکھ کر ذبح نہ کیا جائے بلکہ پانی پلا کر ذبح کیا جائے، ٹھنڈا ہونے سے پہلے نہ تو کھال اُتاری جائے اور نہ اس کا کوئی عضو کاٹا جائے۔

جانوروں کے ضمن میں ایک احتیاط یہ بھی ملحوظ رہے کہ دودھ والے جانور کا دودھ دوہتے ہوئے سارا دودھ نہ نکالا جائے بلکہ کچھ اس کے بچوں کے لیے چھوڑا جائے۔ دودھ نکالنے والے کے ناخن تیز اور لمبے نہ ہوں اور نہ جانوروں کو بے جا مارا پیٹا جائے۔

یہاں پر سوچنے کی بات یہ ہے کہ جو دین حلال جانور کے ذبح کرنے کے لیے اتنے آداب سکھاتا ہے، وہ دوسرے انسانوں سے برتاؤ کرنے کے کتنے آداب سکھاتا ہوگا۔ ہم میں سے ہر شخص کو اپنی زندگی کے تمام معاملات، کام کاج اور اپنی روش اور رویے پر نظر ڈال کر دیکھنا چاہیے کہ کہیں میرے اندر بے سلیقہ پن، اُجڈ پن، بے ڈھنگا پن اور بے تمیزی تو نہیں ہے، میرا برتاؤ دوسروں کے لیے تکلیف دہ، ناگوار اور ناپسند تو نہیں ہے اور اگر ایسا ہے تو اس کی اصلاح ہونی چاہیے اور اپنی تربیت وتہذیب کر کے اچھا اور بھلا مومن بننا چاہیے۔

حدیث نمبر 18

مثالی مومن

عَنْ أَبِیْ ذَرٍّ جُنْدُبِ بْنِ جُنَادَةَ وَأَبِیْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍؓ عَنْ رَسُوْلِ اللہِ ﷺ قَالَ: "اِتَّقِ اللہَ حَیْثُمَا كُنْتَ وَأَتْبِعِ السَّیِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ. (رواہ الترمذی)

''حضرت ابوذر جندب بن جنادہ اور حضرت ابوعبدالرحمٰن معاذ بن جبلؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''تم جہاں کہیں بھی ہو، اللہ سے ڈرتے رہو اور گناہ ہو جانے کے بعد نیکی کرو، وہ نیکی گناہ کو مٹا دے گی اور لوگوں سے حسن سلوک (اچھے اخلاق) سے پیش آؤ۔''

اس حدیث کے پہلے راوی حضرت ابوذر غفاری ہیں، ان کا نام جندب ہے اور یہ غفار قبیلے سے تھے۔ بعض روایات کے موجب یہ مکے میں اسلام قبول کرنے والے پانچویں مسلمان ہیں۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اپنے قبیلے کی طرف واپس جانے لگے تو آپ ﷺ نے نصیحت کرتے ہوئے مذکورہ بالا تین اہم باتیں ارشاد فرمائیں:

تقویٰ:

پہلی بات تقویٰ ہے، تقویٰ کا کلمہ وقی (و ق ی) سے نکلا ہے جس کے لغوی معنی ہیں پرہیز کرنا، بچنا، بچانا اور ڈرنا۔ شرعی اصطلاح میں اس کے معنی ہیں اللہ کا خیال رکھتے ہوئے اطاعت کرنا اور گناہوں سے بچنا۔ تقویٰ کے دوسرے اصطلاحی معنی یہ ہیں اللہ کو خوش کرنے والے کاموں کو کرنا اور اس کو ناراض کرنے والے کاموں کو ترک کرنا۔ قرآن مجید میں تقویٰ کی صفت اختیار کرنے کے لیے بہت تاکید آئی ہے اور اس لفظ کے مصدر (روٹ) سے

بنے ہوئے مختلف الفاظ ۲۵۷ مرتبہ استعمال ہوئے ہیں اس سے بھی اس کی اہمیت وضرورت کا اندازہ ہوسکتا ہے اسی طرح کتنی ہی احادیث میں اس کا بیان آیا ہے۔

تقویٰ دل کی ایک ایسی کیفیت ہے جس کے ہونے پر اللہ تعالیٰ سے بندے کا تعلق مضبوط ہوتا ہے اور اس کے ناراض ہونے کا خوف رہتا ہے۔ نیز اس کے احکام پر چلنے کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور اس کی نافرمانی سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ. (الحج ۲۲:۳۲)

''اور جو شخص اللہ کے شعائر (دینی نشانات) کی تعظیم کرتا ہے تو یہ دل کے تقویٰ کی وجہ سے ہے۔''

ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ''التقویٰ ھھنا'' یعنی تقویٰ یہاں پر ہے۔

مومن تقویٰ والی زندگی کیسے گزارے اس کا اندازہ اس روایت سے کیجیے۔ حضرت عمر بن خطابؓ نے ابی بن کعبؓ سے سوال کیا کہ تقویٰ کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا ''کیا آپ کبھی ایسے راستے پر چلے ہیں جس میں کانٹوں والی جھاڑیاں ہوں؟'' حضرت عمرؓ نے کہا ''ہاں!'' حضرت ابیؓ نے کہا ''اس وقت آپ کیسے راستہ طے کرتے ہیں؟'' حضرت عمرؓ نے جواب دیا ''ایسی حالت میں اپنے کپڑوں کو سمیٹ کر اپنے آپ کو کانٹوں اور جھاڑیوں کی ٹہنیوں سے بچاتے ہوئے گزرتا ہوں۔'' حضرت ابیؓ نے کہا ''یہی تو تقویٰ ہے۔'' (ابن کثیر)

اسی بات کو شاعر نے اس طرح کہا ہے ؎

خَلِ الذُّنُوْبَ صَغِيْرَهَا وَكَبِيْرَهَا ذَاكَ التُّقٰى
وَاصْنَعْ كَمَاشٍ فَوْقَ اَرْضِ الشَّوْكِ يَحْذَرُ مَا يَرٰى
لَا تَحْقِرَنَّ صَغِيْرَةً فَاِنَّ اِنَّ الْجِبَالَ مِنَ الْحَصٰى

''چھوٹے اور بڑے گناہ ترک کردو، یہی تقویٰ ہے اور اس شخص کا طریقہ اختیار کرو جو کانٹوں والی زمین پر ہر چیز سے بچتے ہوئے راہ طے کرتا ہے۔

کسی گناہ کو ہرگز حقیر نہ سمجھو، بڑے جبل چھوٹے پتھروں سے ہی بنے ہوتے ہیں''۔

انسان دنیا کی زندگی اس طرح گزارے کہ اس میں اللہ کی ناراضگی کا خوف ہو، بُرائیوں اور دنیاوی آلائشوں سے کنارہ کش رہے اور اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی فرماں برداری میں وقت گزارے بس یہی تقویٰ کی زندگی ہے اور یہی اہم چیز اور اہم بات ہے۔

تقویٰ کی زندگی گزارنے کے لیے ایسے کاموں سے بھی دُوری اختیار کی جائے جو بظاہر تو جائز ہیں لیکن ناجائز کاموں کے قریب ہیں یا جن کے بارے میں شک اور شبہ ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

''بندہ اس وقت تک متقین کے درجے کو نہیں پہنچ سکتا جب تک وہ باتیں بھی نہ چھوڑ دے جن میں بظاہر کوئی حرج نہیں ہے اس خیال سے کہ کہیں ان کی وجہ سے حرج (گناہ) والے کاموں میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔'' ()

شاعر نے کہا

چیست تقویٰ ترک شبہات وحرام
نے قماش ودختر وفرزند وزن

یعنی تقویٰ نام ہے حرام کاموں اور شک وشبہات والی باتوں کا چھوڑنا، لباس اور آل اولاد اور بیوی کو چھوڑنا تقویٰ نہیں ہے۔

تقویٰ کے تین درجے ہیں، اس کا ادنیٰ اور ابتدائی درجہ یہ ہے کہ آدمی ایمان لا کر کفر وشرک کی باتوں سے کنارہ کشی اختیار کرے اور دین کے بنیادی فرائض کی پابندی کرے۔ مفسرین کرامؒ نے سورۃ بقرہ کی ابتدائی پانچ آیتوں سے دلیل لیتے ہوئے اس درجے کے لیے پانچ شرائط رکھی ہیں یعنی غیب پر ایمان لانا، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، آسمانی ہدایت (وحی) پر ایمان رکھنا اور آخرت پر یقین رکھنا' جو مسلمان یہ کام کرے، وہ متقی ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ ہر اس بات اور کام سے پرہیز اور کنارہ کشی کرنا جو اللہ اور اس کے رسول کو ناپسند ہے، مومن کے لیے یہ درجہ مطلوب ومقصود ہے۔

تقویٰ کا تیسرا درجہ جو سب سے اعلیٰ اور افضل ہے اور تمام انبیاء اور مقربین کو حاصل ہے، وہ یہ ہے کہ ہر وقت اور ہر گھڑی اپنے دل کو غیر اللہ سے پاک کر کے اللہ کی رضا حاصل

کرنے میں مشغول رکھے۔

حاصل یہ کہ تقویٰ ہر نیکی کی بنیاد ہے اور خدا سے بے خوف ہونا اور تقویٰ ترک کردینا ہر بُرائی کا سرا ہے اسی لیے نبی کریم ﷺ نے اپنے پیارے صحابیؓ کو فرمایا کہ ''تم جہاں بھی رہو اور جس حالت میں ہو، اللہ کا خوف اختیار کرو۔''

بُرائی کو مٹانا:

حدیث میں دوسری اہم بات جو فرمائی گئی ہے، وہ ہے بُرائی کو نیکی سے مٹانا اور ختم کرنا۔ انسان چونکہ خطا کا پُتلا ہے جس سے بشری تقاضوں اور فطری و طبعی جذبات کی وجہ سے انفرادی اور اجتماعی زندگی میں شیطانی وسوسوں اور نفسانی خواہشوں کی بناء پر کوئی نہ کوئی غلطی ہوتی رہتی ہے اسی لیے آپ ﷺ نے اپنے پیارے صحابیؓ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ تجھ سے کوئی خطا سرزد ہو جائے تو اسے مٹانے اور اس کے اثرات ختم کرنے کے لیے اس کے بعد نیکی کرو، یہ نیکی اسے مٹا دے گی اور وہ صاف ہو جائے گی۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئٰتِ. (ھود۱۱-۱۱۴)

''بلاشبہ نیکیاں بُرائیوں کو ختم کر دیتی ہیں۔''

بُرائی کے بَعد نیکی کرنے کی کئی صورتیں ہیں جسے انسان اپنی حالت اور بُرائی کی نوعیت کو مدنظر رکھ کر اختیار کرے۔ سب سے پہلے استغفار کرے، درگاہِ خداوندی میں توبہ کرے پھر اپنے نفس کو بُرائی کرنے پر تادیب کرے اور سزا دے یعنی کوئی بدنی عبادت کرے جیسے نفل نمازیں، روزے، تلاوت، اور ذکر واذکار وغیرہ۔ نیز کوئی مالی عبادت بھی کرے کیونکہ مال خرچ کرنے سے نفس کی اچھی خاصی گوشمالی ہوتی ہے، اگر بُرائی کا تعلق کسی بندے کی حق تلفی سے ہے تو اس کا ایک دَم حق ادا کرنا اور اس سے معافی طلب کرنا چاہیے۔ حقوق العباد کا معاملہ بہت اہم اور مشکل ہے، سو جس کی حق تلفی ہوئی ہے اس سے معاف کرانے سے ہی یہ معاف ہوگا۔ معاف کرانے میں متعلقہ شخص کے سامنے قصور کے اعتراف کا اشارہ بھی کیا جائے جیسے کسی کی غیبت کی ہے تو کہے ''برادر! میں نے آپ کے بارے میں کچھ نامناسب

باتیں کی ہوں گی جو مجھے کرنی نہ چاہئیں تھیں، مجھے آپ معاف کر دیں'' لیکن اگر کوئی ایسی بات ہے جو اسے معلوم نہیں ہے اور معلوم ہونے پر اسے زیادہ تکلیف اور دُکھ ہوگا تو اسے ظاہر نہ کرے اور ایسے ہی معافی طلب کرے۔ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے فرمانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نفس کا محاسبہ کیا جائے اور اس کی تادیب کی جائے۔ ارشادِ ربانی ہے:

یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ.

(الحشر: ۵۹،۱۸)

''ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور ہر نفس (انسان) کو دیکھنا چاہیے کہ اس نے کل (قیامت) کے لیے کیا ثمر بنایا ہے۔''

ارشادِ نبوی ہے:

حَاسِبُوْا قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا.

''اپنے نفس سے حساب لو اس سے پہلے کہ تم سے حساب لیا جائے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کوئی بُرائی کرنے کے بعد صرف زبان سے توبہ کرنا کافی نہیں ہے بلکہ اس پر ندامت کرنا اور نیک عمل کرنا تا کہ اس کے اثرات ختم ہوں اور نفس بھی آئندہ بُرائی کرنے سے باز رہے، ضروری ہے۔

حسن سلوک:

تیسری بات آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمائی ''لوگوں سے حسن سلوک (اچھے اخلاق) سے پیش آؤ۔'' اخلاقِ حسنہ اسلام کی بنیادی باتوں میں سے ہیں، قرآن مجید اور حدیث شریف کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مکے شریف میں اسلام کی جن باتوں پر بہت زیادہ زور دیا گیا، ان میں توحید، رسالت، آخرت اور اخلاقِ حسنہ شامل ہیں۔ خود زیرِ مطالعہ حدیث بھی اسلام کے ابتدائی دور کی ہے جس میں اخلاقی تعلیم بیان ہوئی ہے۔

''اخلاقِ حسنہ'' ایک جامع کلمہ ہے جس کا مفہوم اور مطلب ہے لوگوں سے بھلائی کرنا اور ان کو تکلیف دینے سے بچنا۔ دینِ اسلام میں اخلاقِ حسنہ کی کتنی اہمیت ہے اس پر چند ایک احادیث درج کی جاتی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''مومنوں میں کامل ایمان والا وہ ہے جو ان میں اچھے اخلاق والا ہو اور بہترین وہ ہے جو اپنی عورتوں سے اچھا برتاؤ کرے۔'' (الترمذی)

ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے دین اسلام پسند کیا ہے پس تم اس کی تکریم اور قدر، اخلاقِ حسنہ اور سخاوت سے کرو کیونکہ ان دو کے سوا وہ کامل نہیں ہوگا یعنی نامکمل رہے گا۔''

ایک شخص نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ ''تمام اعمال میں افضل کون سا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا ''اچھے اخلاق''

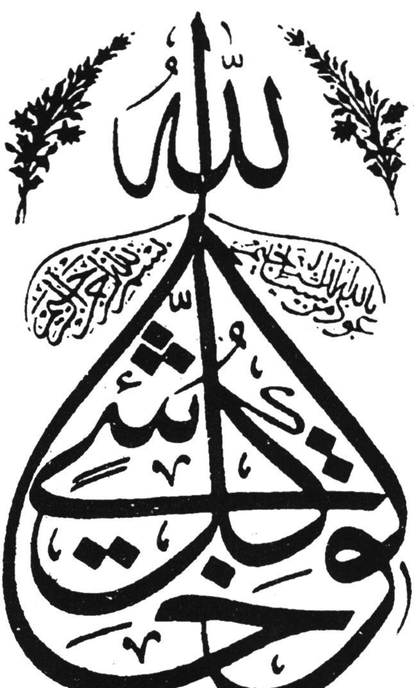
ایک مرتبہ آپ ﷺ نے فرمایا ''تم اپنے مال خرچ کر کے لوگوں کی تمام ضروریات پوری نہیں کر سکتے۔ پس اس سے خوش خلقی اور اچھے اخلاق کا برتاؤ کرو۔ (ابویعلیٰ والبیہقی)

جب آیت خُـذِ العَفوَ...... (الاعراف ۷:۱۹۹) نازل ہوئی تو جبرائیل علیہ السلام نے آپ ﷺ کو اس کی یہ تفسیر بتائی جو تم سے زیادتی کرے، تم اسے معاف کرو، جو تم سے قطع تعلق کرے، تم اس سے جوڑو اور جو تمہیں تمہارے حق سے محروم کرے تو بھی تم اسے دو۔''

قیامت کے دن جو اچھے اعمال میزان میں بھاری ہوں گے، ان میں اخلاقِ حسنہ کا بڑا حصہ ہے پھر جن بُرائیوں کی وجہ سے انسان کی نیکیاں دوسرے لے جائیں گے، ان میں زیادہ حصہ بُرے اخلاق اور لوگوں کی حق تلفی کا ہے۔

زیرِ مطالعہ حدیث کا ایک اور پہلو بھی قابلِ غور ہے کہ ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ دوسرے انسان اس کی عزت کریں، احترام کا مقام دیں اور محبت کریں تو اسے چاہیے کہ وہ بھی دوسروں کا احترام وعزت کرے، ان سے محبت کا اظہار کرے، ان سے حسنِ سلوک کرے اور ان سے خیر خواہی کرے اس طرح یقیناً وہ بھی جواب میں یہی باتیں کریں گے اور اسے وہ تمام بھلائیاں ملیں گی جو پہلے خود کرے گا۔ اسلامی تعلیم میں اس بات پر بہت زور دیا گیا ہے اور یہی بات کامیاب زندگی گزارنے کا راز ہے یعنی تم لوگوں سے اچھا رویہ اختیار کرو تو دنیا خود بخو، تم سے اچھا رویہ اختیار کرے گی، تم ہمدرد بنو تو دنیا تمہاری ہمدرد بنے گی، تم جیسا بوؤ گے ویسا کاٹو گے۔ ارشاد ہے ''کَمَا تَدِینُ تُدَانُ'' جیسا کرو گے، ویسا بھرو گے۔''

حدیث پر غور کرنے سے اسلام کے مزاج اور اس کی حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے بڑے حصے (تین چوتھائی) کا تعلق انسانوں کے حقوق اور اجتماعی ومعاشرتی معاملات سے ہے اور ایک حصے (چوتھائی) کا تعلق بندے اور رب کے درمیان تعلقات اور انفرادی زندگی سے ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اسلام ایک ایسا کامل نظامِ زندگی ہے جس میں انسانی زندگی کے تمام معاملات کے لیے رہنمائی اور ہدایت موجود ہے بس ضرورت اخلاص سے عمل کرنے کی ہے۔



حدیث نمبر 19

بہترین توکل

عَنْ أَبِی الْعَبَّاسِ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: ''کُنْتُ خَلْفَ النَّبِیِّ ﷺ یَوْمًا فَقَالَ: یَاغُلَامُ إِنِّی أُعَلِّمُکَ کَلِمَاتٍ، إِحْفَظِ اللهَ یَحْفَظْکَ، إِحْفَظِ اللهَ تَجِدْهُ تُجَاهَکَ، إِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللهَ، وَإِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللهِ، وَاعْلَمْ اَنَّ الْأُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلٰی أَنْ یَنْفَعُوکَ بِشَیْءٍ لَمْ یَنْفَعُوکَ إِلَّا بِشَیْءٍ قَدْ کَتَبَهُ اللهُ لَکَ وَإِنِ اجْتَمِعُوا عَلٰی اَنْ یَضُرُّوکَ بِشَیْءٍ لَمْ یَضُرُّوکَ اِلَّا بِشَیْءٍ قَدْ کَتَبَهُ اللهُ عَلَیْکَ، رُفِعَتِ الْأَقْلَامُ وَجَفَّتِ الصُّحُفُ'' رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ: حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ'' وَفِی رِوَایَةِ غَیْرِ التِّرْمِذِیْ: احْفَظِ اللهَ تَجِدْهُ أَمَامَکَ، وَتَعَرَّفْ إِلٰی اللهِ فِی الرَّخَاءِ یَعْرِفُکَ فِی الشِّدَّةِ وَاعْلَمْ اَنَّ مَا أَخْطَأَکَ لَمْ یَکُنْ لِیُصِیبَکَ، وَمَا أَصَابَکَ لَمْ یَکُنْ لِیُخْطِئَکَ، وَاعْلَمْ أَنَّ النَّصْرَ مَعَ الصَّبْرِ، وَأَنَّ الْفَرَجَ مَعَ الْکَرْبِ، وَأَنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا.''

''حضرت ابوالعباس عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک دن میں نبی کریم ﷺ کے پیچھے چل رہا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا ''اے بچے! میں تمہیں چند باتیں سکھاتا ہوں، اللہ کا دھیان رکھو، وہ تمہاری حفاظت کرے گا۔ اللہ کو یاد رکھو تو تم اسے اپنے سامنے پاؤ گے، جب بھی سوال کرنے کی نوبت آئے تو اللہ ہی سے سوال کرو، جب مدد کی ضرورت ہو تو اللہ ہی سے مدد مانگو اور یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلو کہ اگر ساری اُمت اس

غرض سے جمع ہو جائے کہ تمہیں کوئی نفع پہنچائے تو وہ تمہیں اتنا ہی نفع پہنچا سکتی ہے جتنا اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے اور اگر سارے لوگ اس غرض سے جمع ہو جائیں کہ تمہیں نقصان پہنچائیں تو اتنا ہی نقصان پہنچا سکیں گے جتنا اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے فیصلے لکھنے والے قلم اُٹھا لے گئے اور صحیفوں کی تحریری سوکھ چکی ہیں۔''

ترمذی کے علاوہ دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں:

''اللہ کا دھیان رکھو، تم اسے اپنے سامنے پاؤ گے، آرام وراحت کے زمانے میں اللہ کا خوب دھیان رکھو، وہ سختی کے زمانے میں تمہارا دھیان رکھے گا اور یہ بات اچھی طرح جان لو کہ جو مصیبت تم سے ٹل گئی ہے، وہ تم تک پہنچنے والی ہی نہ تھی اور جو مصیبت تم پر آئی ہے، وہ تم سے ٹلنے والی ہی نہیں تھی اور یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ مدد صبر سے وابستہ ہے اور کشادگی تکلیف کے ساتھ ہے اور یہ بھی یقین رکھو کہ ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔''

تشریح:

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نبی کریم ﷺ کے چچازاد بھائی اور نہایت ذہین اور دانا تھے آپ ﷺ نے انہیں دعا دی تھی ''اے پروردگار! انہیں دین کی سمجھ عطا کر اور تاویل (تفسیر) کی تعلیم عطا کر'' اسی طرح انہیں حکمت عطا ہونے کی دعا کی تھی۔ یہ انہیں دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ وہ اُمتِ محمدیہؐ کے بڑے علماء میں سے ہیں اور قرآن مجید کے بڑے مفسروں میں ان کا شمار ہوتا ہے، عمر میں چھوٹا ہونے کے باوجود انہیں لائق سمجھ کر آپ نے یہ وصیتیں فرمائی ہیں، یہ نصائح تھوڑی سی تشریح کے ساتھ علیحدہ بیان کی جاتی ہیں:

(ا) اللہ کا دھیان رکھو، وہ تمہاری حفاظت کرے گا ..... اپنے سامنے پاؤ گے'' یعنی اللہ کے حکم کا خیال رکھیں، اس نے جن باتوں کے کرنے کا حکم دیا ہے، وہ کرتے رہیں اور جن کاموں سے اس نے روکا ہے، ان سے رُک جائیں، جب بندہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق زندگی گزارتا ہے تو اللہ تعالیٰ دونوں جہانوں کی پریشانیوں، مصیبتوں اور آفتوں سے اسے محفوظ رکھتا ہے، جو شخص اللہ کا بن جائے تو ہر چیز اس کا لحاظ کرتی اور

خیال رکھتی ہے، نیک اعمال کی برکت سے کتنی ہی مصیبتیں ٹل جاتی ہیں اور بندہ قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد پاتا ہے۔

ہجرتِ مدینہ کے سفر میں جب کافر آپ کو تلاش کرتے ہوئے قریب پہنچ گئے اور حضرت ابوبکرؓ کو اس پر پریشانی لاحق ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا. (التوبہ۹:۴۰)

''غم نہ کریں اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

اس نوع کی کتنی ہی قرآنی آیات اور احادیثِ نبوی واضح کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کرنے کی بناء پر انسان سے مصیبتیں ٹل جاتی ہیں۔

(۲) ''جب سوال کرنے کی نوبت آئے تو اللہ ہی سے کرو۔''

دنیوی زندگی میں انسان کو کئی ضرورتیں اور حاجتیں پیش آتی رہتی ہیں، ان حاجتوں کی بڑی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ ہیں جن کے وقوع پذیر ہونے میں ظاہری اسباب وسائل دخیل نہیں ہوتے اور انسانوں کے ہاتھوں پوری نہیں ہوتیں جیسے ہدایت کا حصول، علمِ دین، قرآن وسنت کا فہم، روحانی بیماریوں سے شفا، دنیا وآخرت کی مصیبتوں سے نجات، بارش اور فصلوں کی پیداوار وغیرہ۔ ان حاجتوں کی برآری میں صرف اللہ تعالیٰ سے ہی سوال کرنا اور اللہ کا در چھوڑ کر کسی اور در پر سوال نہیں ہونا چاہیے۔ ''وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ'' میں اسی قسم کی مدد اور سوال کرنا مراد ہے۔

دوسری وہ حاجتیں اور ضرورتیں ہیں جو ظاہری اسباب ووسائل سے انسانوں کے ہاتھوں ظاہر ہوتی ہیں، انسان ایسے معاملات میں بھی اللہ تعالیٰ سے سوال کرے گا البتہ سوال کرنے کا طریقہ یہ ہوگا کہ یا اللہ تعالیٰ! بندوں کے دلوں کو نرم کر، انہیں انصاف کرنے کی توفیق عطا کر، انہیں حقوق ادا کرنے کی ہدایت کر، انہیں میری حاجت برآری کا ذریعہ بنا دے اور مجھے ان کے شر سے محفوظ رکھ۔ اس طرح یہ مدد بھی اسی باری تعالیٰ سے طلب کی جائے گی جس کے ہاتھ میں سب کچھ ہے۔

علمائے دین نے استمداد واستعانت حاصل کرنے کی دو قسمیں بیان کی ہیں: ایک استعانت بلا اسباب (اسباب ووسائل کے سوا مدد طلب کرنا) جیسے اوپر سوال کی پہلی قسم میں

بیان کیا گیا۔ ایسی مدد لینے کو شریعت کی اصطلاح میں استعانت مافوق الاسباب یعنی اسباب ووسائل کے بغیر یا اسباب سے ہٹ کر مدد چاہنا' ایسی مدد صرف اللہ سے ہی مانگی جائے گی کیونکہ وہی ایسی مدد کرسکتا ہے اور دوسرا کوئی اس نوع میں مدد نہیں کرسکتا ہے۔ "اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" میں یہی مدد مراد ہے۔ دوسری قسم استعانت تحت الاسباب جس میں ظاہری اور مادی ذرائع کام آتے ہیں اور ان کے ماتحت کام سرانجام دیتے ہیں جیسے کسی سے مالی اور مادی مدد طلب کرنا اور مدد مانگنا بالکل جائز ہے اس سے ایمان' توحید' تقویٰ اور توکل میں کوئی فرق نہیں آتا۔

(۳) "اور یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلو...... تحریریں سُوکھ چکی ہیں۔"

اس نصیحت میں دو باتیں مومن کو ذہن نشین کرائی گئی ہیں' ایک اللہ پر توکل اور دوسری تقدیر۔ حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ کائنات کو چلانے میں مخلوق کو کسی بات کا اختیار نہیں ہے مختارِ کل صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے' اس کے فیصلے کو کوئی بدل نہیں سکتا' نہ اس کی لکھی ہوئی تقدیر کو کوئی تبدیل کرسکتا ہے اور نہ ہی اس میں پھیر گھیر کرسکتا ہے' نہ اس کی عطا کوئی روک سکتا ہے اور نہ ہی اس کی بھیجی ہوئی مصیبت کو ٹال سکتا ہے' جو کچھ اس نے لکھا ہے' وہی ہوگا۔ قلم اُٹھا لیے گئے اور صحیفے لپیٹ دیئے گئے کا مفہوم یہ ہے کہ تقدیر مبرم (اَٹل) میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرٌ. (الحدید۵۷:۲۲)

"کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے جو زمین میں یا تمہارے اپنے نفس پر نازل ہوتی ہو اور ہم نے اس کو پیدا کرنے سے پہلے ایک کتاب (نوشتہ تقدیر) میں لکھ نہ رکھا ہو' ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔"

اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

مَا یَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِکَ لَهَا وَمَا یُمْسِکْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ. (فاطر۳۵:۲)

"اللہ جس رحمت کا بھی دروازہ لوگوں کے لیے کھول دے' اسے کوئی روکنے والا

نہیں اور جسے وہ بند کر دے' اسے اللہ کے بعد پھر کوئی دوسرا کھولنے والا نہیں' وہ زبردست اور حکیم ہے۔''

اس سلسلے میں مزید آمدہ آیات سورہ یونس ۱۰۲ اور ۱۰۷ غور سے پڑھیں۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ اللہ اور رسول ﷺ کی واضح ہدایت موجود ہونے کے باوجود ہزاروں' لاکھوں مسلمان تقدیر پر ایمان رکھتے ہوئے قبروں' درگاہوں' ٹھگ پیروں' فقیروں اور آستانوں کے دروں پر ٹھوکریں کھاتے رہتے ہیں' ان سے اپنی مرادیں مانگتے ہیں اور شرک میں مبتلا ہو کر اپنا ایمان کمزور کرتے رہتے ہیں۔ افسوس صد افسوس!

(۴) آرام وراحت کے زمانے میں......تمہارا دھیان رکھے گا۔''

نبی کریم ﷺ نے کامل مومن کی ایک اہم صفت یہ بتائی کہ مومن کا تنگی وفراخی' دُکھ وسکھ' رنج وراحت اور خوشی وغمی میں اللہ تعالیٰ سے تعلق یکساں ہوتا ہے' اس کی زندگی میں اعتدال ویکسانیت ہوتی ہے' ایسا نہیں کہ دُکھ اور تکلیف میں تو اللہ تعالیٰ کو خوب گڑگڑا کر اور آہ وزاری کے ساتھ پکارے۔ نیکیوں' عبادتوں اوراد وظائف میں پوری طرح محو ہو جائے اور فراخی وکشادگی ہو دھن ودولت' آل واولاد اور عہدے ومرتبے کی دولت مل جائے تو خدا کو بھلا دے' ایسا طرزِ عمل مومن کا تو نہیں ہو سکتا البتہ منافقین اور دنیا پرستوں کا ہو سکتا ہے۔

مسلمان ہر وقت اور ہر حال میں اللہ کا بندہ ہے اور اپنا تعلق اپنے رب سے عبادت ومحبت میں یکساں رکھتا ہے' بندہ جب آرام وراحت کے وقت میں اللہ تعالیٰ کو یاد رکھتا ہے اور اس سے دعائیں مانگتا ہے تو مصیبت آنے کے وقت جو دعا مانگتا ہے تو وہ قبول ہوتی ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

مَنْ سَرَّهُ اَنْ يَسْتَجِيبَ اللّٰهُ لَهُ عِنْدَ الشَّدَائِدِ فَلْيُكْثِرِ الدُّعَآءَ فِي الرَّخَاءِ. (ترمذی)

''جسے اس بات سے خوشی ہو کہ تنگی اور سختی کے وقت اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول کرے تو اسے چاہیے کہ فراخی کے دنوں میں کثرت سے دعا کرے۔''

شاعر نے اس کیفیت کو کیا خوب بیان کیا ہے۔

ظفر آدمی اس کو نہ جانیئے گا ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم وذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

(۵) ''اور یہ بات اچھی طرح جان لو...... وہ تم سے ٹلنے والی ہی نہ تھی''

انسان کو اس دنیاوی زندگی میں بارہا نفع اور نقصان سے واسطہ سابقہ پیش آتا ہے' کتنے ہی مواقع ایسے آتے ہیں جن میں آدمی سمجھتا ہے کہ یہ نعمت ملنے والی ہے لیکن مل نہیں پاتی اور انسان اس سے محروم رہ جاتا ہے۔ کبھی انسان مصیبت اور نقصان سے بچنے کی بڑی کوشش کرتا ہے لیکن بچ نہیں سکتا بلکہ اس میں مبتلا ہو کر رہتا ہے۔ عام طور پر ان دونوں حالتوں میں پریشان ہوتا ہے' افسوس اور دُکھ میں گھر جاتا ہے' پشیمانی اور افسوس کر کے کتنی ہی ذہنی اور جسمانی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ نبی رحمت ﷺ نے ایسے موقع پر مسلمان کو تقدیر پر ایمان پختہ کرنے اور اس کے مطابق پیش آمدہ معاملے کو دیکھنے کی تلقین فرمائی ہے اس حقیقت کو اس طرح بیان فرمایا:

قُلْ لَنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰنَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ. (التوبہ۹:۵۱)

''آپ ان سے کہیے ہمیں ہرگز کوئی بُرائی یا بھلائی نہیں پہنچتی مگر وہ جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے' وہی ہمارا مولیٰ ہے اور مومنوں کو اس پر بھروسہ کرنا چاہیے۔''

آج ہم زندگی کے کتنے ہی مسائل' معاملات' مشاکل ومصائب میں گھرے ہوئے ہیں اور کچھ تہذیب جدید کے واردات وعوارض ہیں جن میں جکڑے ہوئے ہیں' جن کی وجہ سے بے شمار ذہنی' جسمانی اور نفسیاتی امراض میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ یہ تمام باتیں تقدیر پر ایمان مضبوط کرنے اور آپ ﷺ کے ان ارشادات کو پیش نظر رکھنے سے دُور ہو سکتی ہیں۔

(۶) ''یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ نصرت صبر سے وابستہ ہے۔''

انسان تکلیف' مصیبت اور مشکل کے وقت صبر اختیار کرے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ.

(البقرہ۲:۱۵۳)

''ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو۔ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

شریعتِ مطہرہ میں صبر کے معنی مفہوم اور دائرہ وسیع ہے۔ صبر کے لفظی معنی ہیں جم جانا' ٹک جانا اور ثابت قدم رہنا۔ شرعی معنی کے لحاظ سے صبر کی تین اقسام ہیں

(الف) اللہ کی اطاعت وعبادت پر قائم رہنا۔

(ب) اللہ کی نافرمانی اور گناہوں سے بچنا اور اس پر آخر وقت تک قائم رہنا۔

(ج) مصیبت کے وقت جزع فزع نہ کرنا۔

ان تینوں قسموں کے لحاظ سے صبر کرنا شرعی اور کامل صبر ہے۔

(۷) ''اور کشادگی تکلیف کے ساتھ ہے اور یہ بھی یقین رکھو کہ ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔''

اس دنیا کی زندگی میں دُکھ سکھ اور رنج وراحت ساتھ ساتھ ہیں' دُکھ کے بعد سکھ اور رنج کے بعد راحت آتے ہی رہتے ہیں' انسان کے لیے اسلام نے دُکھ اور سکھ کا ایک پہلو یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو تنگی وفراخی' بدحالی اور خوشحالی' تونگری وفقیری' موت وحیات اور بیماریوں اور جنگوں سے آزماتا ہے (ملاحظہ ہو سورۂ بقرہ آیات ۱۵۵' ۱۶۷ سورۂ الفجر آیات ۱۵-۱۶ اور البقرہ ۲۱۴) لہٰذا مسلمان کو چاہیے کہ ہر تنگی وفراخی کو اپنے لیے خدائی آزمائش سمجھے اور اس سے کامیابی سے پار ہونے کی کوشش کرے۔

دوسری اہم بات یہ فرمائی گئی کہ مومن تنگی وتکلیف میں مایوس ودل شکستہ ہو کر اور ناامید بن کر نہ بیٹھ جائے لیکن اللہ پر امید رکھ کر اس سے نکلنے کے لیے مسلسل محنت ومشقت اور کوشش کرتا رہے۔ سورۂ الم نشرح کے مضمون پر غور کرے تو معلوم ہوگا کہ آخرکار آسانی وفراخی آئے گی اور ایک دن تنگی ضرور دُور ہوگی۔

حدیث نمبر 20

شرم وحیاء

عَنْ أَبِیْ مَسْعُوْدٍ عُقْبَةَ بْنِ عَمْرٍو الْأَنْصَارِیِّ الْبَدْرِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اِنَّ مِمَّا أَدْرَکَ النَّاسُ مِنْ کَلَامِ النُّبُوَّةِ الْأُوْلٰی: اِذَا لَمْ تَسْتَحِیْ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ. (رواہ البخاری)

''حضرت ابومسعود عقبہ بن عمرو انصاریؓ بدری صحابی ہیں' روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''پچھلی نبوت کی باتوں میں سے جو باتیں لوگوں تک پہنچی ہیں' ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب تم میں شرم ہی نہ رہے تو جو چاہو کرتے پھرو۔''

تشریح:

حیاء انسان کا وہ فطری وصف ہے جو ہر انسان میں پیدائشی اور طبعی طور پر موجود ہوتا ہے جس سے اس کی کتنی ہی روحانی' اخلاقی اور معاشرتی بھلائیوں میں اضافہ ہوتا ہے اور عفت و پاک دامنی اس کی وجہ سے باقی رہتی ہے' سخاوت وفیاضی کی صفت پیدا ہوتی ہے اور باہمی رواداری اور مروت اسی کی وجہ سے باقی رہتی ہے۔

اگرچہ ہر انسان فطری طور پر حیاء کے زیور سے آراستہ ہوتا ہے لیکن جس معاشرے میں وہ رہتا ہے اور اس میں حیاء کی جو اقدار ہوتی ہے اس کے مطابق یہ صفت گھٹتی بڑھتی ہے' جہاں اس وصف کا چرچا اور چلن ہو' وہاں پر یہ بڑھتی ہے اور جہاں بے حیائی اور بے شرمی عام ہو تو وہاں کے لوگ اس سے آہستہ آہستہ محروم ہو جاتے ہیں اور انسانی فطرت سے کم ہو کر آخر کار محو ہو جاتی ہے۔

حیا کی صفت تمام رسولوں اور نبیوں کی تعلیم میں شامل رہی ہے چنانچہ اسی بات کا تذکرہ مذکورہ بالا حدیث میں آیا ہے اسی طرح یہ خلق تمام ادیان و مذاہب میں پایا جاتا ہے جس سے انسانی زندگی میں اس کی اہمیت اور ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

علماء نے حیاء کی کئی تعریفیں بیان کی ہیں' ان میں سے دو کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ امام راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں:

''حیاء وہ وصف ہے جس کی وجہ سے بُرا کام کرنے سے نفس میں تنگی محسوس ہوتی ہے۔''

جمہور علماء کے ہاں ''حیاء وہ خلق ہے جو انسان کو نیکی کرنے اور بُرائی سے روکنے پر اُبھارتا ہے۔''

دینِ اسلام میں حیاء کی فطری صفت کو نہ صرف باقی رکھنے پر زور دیا گیا ہے بلکہ اس کے بڑھانے کا بھی مناسب بندوبست کیا گیا ہے جیسے نظریں پست رکھنا' بے حیائی کی باتیں نہ کرنا' بے حیائی کے کاموں سے کنارہ کشی کرنا' ستر نہ کھولنا حتیٰ کہ تنہائی اور غسل خانے میں بھی ضرورت سے زیادہ ستر نہ کھولنا' یہ سب بندوبست اس لیے کیے گئے ہیں کہ حیاء کا جوہر نہ صرف باقی رہے بلکہ بڑھتا رہے۔ حیاء کی ضد بے حیائی' بے شرمی اور فحاشی ہے جس سے قرآن وحدیث میں بڑی شدت سے روکا گیا ہے اور ایسے کاموں پر آخرت کی سزا وعذاب کے ساتھ دنیا میں بھی بھاری سزائیں رکھی گئی ہیں۔ اگر انسان سے یہ صفت ختم ہو جائے تو پھر ہر قسم کی بُرائی کرنا آسان ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ شیطان لعین نے سب سے پہلے آدم اور حوا علیہما السلام سے ان کا لباس اُتروایا لیکن ان میں فطری حیاء کا غلبہ تھا لہٰذا وہ جنت کے پتوں سے اپنے جسم کو ڈھانکنے لگے۔ حیاء اور اخلاق کے تعلق کے بارے میں مشہور کہاوت ہے ''بے حیا باش وہر چہ خواہی کن'' یعنی بے حیاء بن جاؤ پھر جو چاہو کرتے رہو۔''

جس شخص میں یہ صفت ہو اسے گھٹانے کی کوشش نہ کی جائے بلکہ اس کی ہمت افزائی کی جائے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کا ایک انصاری کے پاس سے گزر ہوا جو اپنے بھائی کو حیاء کم کرنے کے بارے میں سمجھا رہا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''اسے چھوڑ دو کیونکہ حیاء ایمان کا حصہ ہے۔''

ایک اور حدیث میں آیا ہے:

اَلْحَیَاءُ شُعْبَۃٌ مِنَ الْاِیْمَانِ.

''یعنی حیاء ایمان کا حصہ ہے۔''

شریعت میں حیاء کا تصور بہت وسیع ہے یعنی انسان اللہ اور رسول اللہ ﷺ سے حیاء کر کے ان کی نافرمانیوں اور بُرائیوں سے بچے۔ ترمذی کی ایک حدیث میں ہے نبی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ سے حیاء کرو جیسا کہ حیاء کرنے کا حق ہے۔''

صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا ''یارسول اللہ ﷺ ہم اللہ سے حیاء کرتے ہیں'' آپ ﷺ نے فرمایا:

''صِرف اتنا نہیں (یعنی زبان سے کہنا کافی نہیں ہے) لیکن اللہ تعالیٰ سے پوری طرح حیاء کرنا یہ ہے کہ تم اپنے سر کو اور جو کچھ اس میں ہے' کان' آنکھ اور زبان کی حفاظت کرو اور پیٹ اور جو کچھ اس میں ہے' اسے (حرام سے) بچاؤ اور موت اور فنا کو یاد رکھو جو شخص آخرت بنانا چاہتا ہے سو دنیا کی زندگی کے ٹھاٹھ باٹھ کو چھوڑ دے (تاکہ اس میں مشغول ہو کر اپنی ذمہ داریوں سے غافل نہ ہو) اور آخرت کو دنیا پر ترجیح دے جس شخص نے ایسے کیا' اس نے اللہ سے حیاء کرنے کا حق ادا کیا۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حیاء کا دائرہ کتنا وسیع ہے لہٰذا انسان کو ہر وقت خیال رکھنا چاہیے کہ کہیں مجھ سے اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی نہ ہو اور کل قیامت کے دن میں ان کے سامنے کیسے پیش ہوں گا اور کیا جواب دوں گا۔ تاہم انسان کو دعوت وتبلیغ' پند ونصیحت' رشد وہدایت' تعلیم وتربیت اور نیکی کا حکم کرنے اور بُرائی سے روکنے میں شرم کرنے سے نقصان ہوگا لہٰذا ایسے موقع پر حق بات کہنے' حق بتانے' پوچھنے اور سوال کرنے میں عار اور شرم محسوس نہیں کرنی چاہیے جیسے ایک حدیث میں آیا ہے:

نِعْمَ النِّسَاءُ نِسَاءَ الْاَنْصَارِ لَمْ یَکُنْ یَمْنَعُھُنَّ الْحَیَاءُ اَنْ یَتَفَقَّھْنَ فِی الدِّیْنِ. (مسلم شریف)

''انصاری عورتیں کیسی اچھی ہیں کہ انہیں دین سیکھنے اور سمجھنے سے حیاء نہیں روکتی۔''

مطلب یہ ہے کہ نیکی کا کام کرتے ہوئے آدمی کو جھجک نہ ہونا چاہیے کیونکہ کسی کو بُرائی سے روکنا اور حق بات کہنے میں شرم کرنا حیاء نہیں ہے بلکہ بزدلی اور ڈرپوکی ہے۔

الغرض حیاء کی وصف میں خیر و بھلائی ہے' دونوں جہانوں کے سردار ﷺ نے فرمایا:

اَلْحَیَاءُ لَا یَاْتِیْ اِلَّا بِخَیْرٍ. (بخاری کتاب الادب باب الحیاء)

''یعنی حیاء سے تو بھلائی ہی آتی ہے۔''

اور ایک دوسری حدیث میں ہے:

''ہر ایک دین کا ایک خلق ہوتا ہے اور اسلام کا خاص خلق حیاء ہے۔''

لہٰذا ہر ایک مسلمان کو چاہیے کہ اپنے اندر حیاء کی صفت پیدا کرے اور اسے بڑھاتا رہے تاکہ کامل مومن بن جائے۔

حدیث نمبر 21

استقامت

عَنْ أَبِیْ عَمْرٍو، (وَقِیْلَ أَبِیْ عَمْرَةَ) سُفْیَانَ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: "قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قُلْ لِیْ فِی الْإِسْلَامِ قَوْلًا لَا أَسْأَلُ عَنْہُ أَحَدًا غَیْرَکَ، قَالَ: قُلْ آمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ. (رواہ مسلم)

"حضرت ابوعمرو سفیان بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا "اللہ کے رسولؐ! مجھے اسلام کے بارے میں ایک ایسی بات بتا دیجیے جس کے بعد آپ ﷺ کے علاوہ اور کسی سے مجھے سوال کرنے کی ضرورت نہ رہے۔" آپ ﷺ نے فرمایا:

"تم کہو آمنت باللہ (میں اللہ پر ایمان لایا) پھر اس پر قائم رہو۔"

تشریح:

استقامت کا لفظ قیام اور قوم سے نکلا ہے جس کے لفظی معنی ہیں سیدھا رہنا یا سیدھا چلنا اور اصطلاحی اور شرعی معنی ہیں "دین کے احکام پر تمام زندگی ثابت قدم رہنا۔"

یہ حدیث ان احادیث میں سے ایک ہے جو جوامع الکلم ہیں یعنی جن کے تھوڑے سے الفاظ ہیں لیکن جامع اور وسیع معنی بیان کیے گئے ہیں۔

استقامت کا کلمہ قرآن مجید میں دس مرتبہ آیا ہے اور جہاں بھی آیا ہے اسی معنی میں آیا ہے کہ اپنی بات پر قائم رہو اور اپنے عہد و اقرار سے روگردانی نہ کرو۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّمَآ اِلٰـھُکُمْ اِلٰـہٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِیْمُوْٓا اِلَیْہِ وَاسْتَغْفِرُوْہُ. (حم السجدہ ۴۱:۶)

''تمہارا معبود ایک اللہ ہی ہے سو اس کی طرف سیدھے رہو اور اس سے مغفرت طلب کرو۔''

یعنی مومن کی عبادات اسی ایک ذات کے لیے ہوں اور اُس کا رُخ اس کی طرف ہو اور کسی حال میں بھی اس سے اپنا رُخ بدل کر اِدھر اُدھر نہ ہو جائے' ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ آپ ﷺ اور آپ کے ساتھیوںؓ کو حکم دیتے ہیں:

فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۚ إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ. (ھود ۱۱:۱۱۲)

''پس اے نبی' تم اور تمہارے وہ ساتھی جو (کفر و بغاوت سے ایمان و اطاعت کی طرف) پلٹ آئے ہیں ٹھیک راہِ راست پر ثابت قدم رہو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے اور بندگی کی حد سے تجاوز نہ کرو' جو کچھ تم کر رہے ہو اس پر تمہارا رب نگاہ رکھتا ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ دنیا و آخرت کی کامیابی' بے خوفی اور بے غمی ان شخصوں کے لیے ہے جو استقامت اختیار کر کے دین پر قائم رہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ. (الاحقاف ۴۶:۱۳)

''بے شک جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہی ہمارا پروردگار ہے پھر اس پر جم گئے ان کے لیے کوئی ڈر نہیں ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

نبی کریم ﷺ نے زیرِ مطالعہ حدیث کے دو کلموں میں سائل کے جواب میں اسلام اور ایمان کے تمام مفہوم و معنی سمیٹ دیئے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنے ایمان کو زبان پر اور دل میں تازہ رکھو اور جن کاموں کے کرنے سے اللہ نے حکم دیا ہے' ان پر عمل کرو اور جن باتوں سے روکا ہے' ان سے رُک جاؤ اور مرتے دَم تک ان پر قائم رہو۔

استقامت کے معنی اور مفہوم پر حضور ﷺ اور صحابہ کرامؓ سے جو روایتیں مذکورہ ہیں' ان میں سے چند ایک درج کی جاتی ہیں۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''کتنے ہی لوگوں نے اللہ کو اپنا رب کہا لیکن پھر کچھ ان میں کافر ہو گئے' ثابت قدم وہ ہے جو اس پر قائم رہے۔'' (نسائی' ابن جریرؒ)

حضرت ابوبکرؓ نے استقامت کی تشریح اس طرح کی ہے:

''ایمان لانے کے بعد اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا اور اس کے علاوہ کسی اور معبود کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔'' (ابن جریر)

حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ منبر پر حم السجدہ کی آیت ۳۰ تلاوت کی اور فرمایا:

''خدا کی قسم! استقامت اختیار کرنے والے وہ ہیں جو اللہ کی اطاعت پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو گئے اور لومڑیوں کی طرح اِدھر اُدھر دوڑتے نہ پھرے۔'' (ابن جریر طبری)

حضرت عثمانؓ نے فرمایا:

''استقامت اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اپنے عمل کو اللہ کے لیے خاص کرے۔''

حضرت علیؓ نے فرمایا:

''استقامت اللہ کے عائد کردہ فرائض کو فرماں برداری کے ساتھ ادا کرنا ہے۔''

استقامت کا کلمہ کہنے میں تو آسان ہے لیکن عمل کرنے میں کافی مشکل ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ پر پورے نزولِ قرآن میں جو آیت مشکل محسوس ہوئی وہ (فَاسْتَقِم كَمَا أُمِرْتَ) تھی۔ آپ نے اس بارے میں فرمایا:

''مجھے سورۂ ھود اور اس جیسی دوسری سورتوں نے بوڑھا کر دیا۔''

حضرت ابوالقاسم قشیریؒ کہتے ہیں:

''استقامت وہ درجہ ہے جس کی بناء پر تمام اعمال کمال کے درجے پر پہنچتے ہیں اور تمام بھلائیاں حاصل ہوتی ہیں جو شخص اپنی کوشش میں ثابت قدم نہیں ہے تو اس کی کوشش بے کار جائے گی اور وہ ناکام ہوگا۔ پہلی اُمتوں کے جو واقعات واحوال قرآن وحدیث میں بیان ہوئے ہیں اور اس اُمت کے لیے نمونے

کے طور پر دیئے گئے ہیں' ان میں سے ایک یہ ہے:

''حضرت خبابؓ بن ارت کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم نے نبی ﷺ سے اپنی مصیبتوں کا حال بیان کیا اور دعا کے لیے التجا کی چونکہ یہ بھی ایک قسم کی جلد بازی اور بے صبری تھی اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا'' تم سے پہلی اُمتوں میں ایسے لوگ بھی گزرے ہیں کہ انہیں زمین میں دفن کر کے اوپر سے آرے چلا کے دونیم کیا جاتا تھا لیکن یہ عذاب انہیں دین سے ہٹا نہیں سکتا تھا اور لوہے کی کنگھیوں سے ان کا گوشت ہڈیوں سے چھیلا اور کھرچا جاتا تھا لیکن یہ انہیں دین سے ہٹا نہیں سکتا تھا۔'' (بخاری)

رسول اللہ ﷺ کی اسی تعلیم کا صحابہ کرامؓ پر جو اثر ہوا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صحابہ کرامؓ پر بڑی مصیبتیں آئیں' سخت ابتلاء آزمائش میں گرفتار ہوئے' طرح طرح کی تکالیف میں مبتلا ہوئے لیکن ذرہ برابر ایمان واسلام سے پیچھے نہیں ہٹے اور رہتی دنیا تک اسلامی تاریخ میں استقامت کی روشن مثالیں اور اعلیٰ نمونے قائم کر گئے۔ یہ مثالیں قائم کرنے میں خباب بن ارتؓ، بلال بن ارباحؓ ،معصب بن عمیر اور زیدؓ وغیرہ پیش پیش ہیں۔

استقامت کی بڑی دو قسمیں ہیں' ایک ایمان وعقیدے کی استقامت اور دوسری عمل کی استقامت اس کا دوسرا نام مداومت اعمال یعنی اعمال کو پابندی سے مستقل طور پر ادا کرنا ہے' جس نیکی کے کام کو اختیار کیا جائے اس پر آخری وقت تک قائم رہا جائے اور ہر حال میں ادائیگی کی جائے اور یہ انداز نہ ہو کہ کبھی تو جوش میں آکر بہت عمل کر لیا' ساری رات جاگ لیے' شب بیداریاں کر لیں اور پھر جب سست ہوئے تو فرائض تک ترک کر دیئے۔ اُم المومنین عائشہ صدیقہؓ سے کسی نے پوچھا کہ ''رسول اللہ ﷺ کا سب سے زیادہ پسندیدہ عمل کون سا تھا؟'' تو انہوں نے فرمایا'' وہ نیکی جس کو ہمیشہ پابندی سے ادا کیا جائے۔''

اس طرح نبی ﷺ نے فرمایا:

''اللہ کے نزدیک سب سے بہتر عمل وہ ہے جسے ہمیشہ کیا جائے اگرچہ وہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔''

آج ہمارے معاشرے میں استقامت (ثابت قدمی) اختیار کرنے کی سخت ضرورت

ہے اس لیے کہ دین و دنیا کی ترقی کے لیے یہ صفت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ دینی تعلیم ہو کہ دنیاوی، کاروبار ہو کہ نوکری، صنعت ہو کہ حرفت، سیاست ہو کہ معاشرت۔ الغرض جو بھی معاملہ ہو اس میں کامیابی اس وقت ہو گی جب اس کی تکمیل تک اور مقصد حاصل کرنے تک استقامت اختیار کی جائے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ استقامت کی صفت ہر مسلمان میں پیدا کرے اور اس کے ثمرات واثرات سے نوازے۔ (آمین)

حدیث نمبر 22

فرائض کی پابندی

عَنْ أَبِیْ عَبْدِ اللهِ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ الْأَنْصَارِیِّ رَضِیَ اللهُ عَنْهُمَا "أَنَّ رَجُلاً سَأَلَ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ فَقَالَ: أَرَأَیْتَ إِذَا صَلَّیْتُ الْمَكْتُوْبَاتِ وَصُمْتُ رَمَضَانَ وَأَحْلَلْتُ الْحَلَالَ وَحَرَّمْتُ الْحَرَامَ وَلَمْ أَزِدْ عَلٰی ذٰلِكَ شَیْئًا أَدْخُلُ الْجَنَّةَ؟ قَالَ: نَعَمْ" رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَمَعْنٰی حَرَّمْتُ الْحَرَامَ: اِجْتَنَبْتُهٗ وَمَعْنٰی أَحْلَلْتُ الْحَلَالَ: فَعَلْتُهٗ مُعْتَقِدًا حِلَّهٗ. (مسلم)

''حضرت ابوعبداللہ جابر انصاریؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کرتے ہوئے عرض کیا ''یہ فرمایئے اگر میں فرض نمازیں ادا کروں، رمضان کے روزے رکھوں، حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھوں اور اس کے علاوہ اور کچھ نہ کروں تو کیا جنت میں داخل ہو جاؤں گا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا ''جی ہاں!''

امام نوویؒ کہتے ہیں ''حرام کو حرام سمجھنے کے معنی ہیں اس سے اجتناب کرنا اور حلال کو حلال قرار دینے سے مراد ہے، اسے حلال سمجھتے ہوئے استعمال کرنا۔''

شارحین حدیث نے لکھا ہے کہ یہ سوال پوچھنے والے نعمان بن قوقل تھے۔ شیخ ابوعمرو بن صلاحؒ کہتے ہیں کہ سائل کے سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے حرام کو حرام سمجھنے اور اس سے اجتناب کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا اور حلال چیز کو حلال قرار دینے اور ایسا اعتقاد رکھنے کا ارادہ واضح کیا تھا۔

درحقیقت ایک مومن کا یہی نقطہ نگاہ اور ذہنی واعتقادی رجحان ہونا چاہیے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ اکرم ﷺ نے حرام کر دی ہے' وہ حرام ہی رہے گی اور میں اس کے قریب بھی نہیں پھٹکوں گا اور جس چیز کو انہوں نے حلال کیا ہے' اسے حرام کرنے کا حق نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ. (النحل ۱۶:۱۱۶)

''اور یہ جو تمہاری زبانیں جھوٹے احکام لگایا کرتی ہیں کہ یہ چیز حلال ہے اور وہ حرام ہے تو اس طرح کے حکم لگا کر اللہ پر جھوٹ نہ باندھو جو لوگ اللہ پر جھوٹے افتراء باندھتے ہیں' وہ ہرگز فلاح نہیں پایا کرتے۔''

یہ آیتِ کریمہ واضح کرتی ہے کہ اللہ کے سوا کسی دوسرے کو حرام وحلال کا فیصلہ کرنے کا حق نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں قانون ساز صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ دوسرا جو شخص بھی جائز وناجائز اور حرام وحلال کا فیصلہ کرنے کی جرأت کرے گا سو اپنے حد سے تجاوز کرنے والا ہوگا' لیکن اگر کوئی شخص قانونِ الٰہی کو سند مانے اور اس کے فرمانوں سے استنباط کرتے ہوئے (قانونی نقطے نکالے اور اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے) یہ کہے کہ یہ چیز یا یہ کلام حلال وجائز ہے تو وہ حدود پار کرنے والا نہیں ہوگا بلکہ انہی حدود کی وضاحت وتشریح کرنے والا ہوگا۔

خودمختاری اور اپنی رائے سے حلال وحرام کرنے والے فعل کو اللہ پر جھوٹ اور بہتان اس لیے کہا گیا ہے کہ جو شخص اس طرح کسی بات یا چیز کے بارے میں حلال وحرام کا حکم لگاتا ہے اس کا یہ فعل دو حالتوں سے خالی نہیں ہے' یا تو وہ اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ جس چیز کو وہ خدائی کتاب کی سند کے بغیر جائز وناجائز کہہ رہا ہے' اسے اللہ نے جائز وناجائز کیا ہے' یا اس کا یہ دعویٰ ہے کہ اللہ نے حلال وحرام کرنے کے اختیار سے دست بردار ہو کر انسان کو اس کی زندگی کے بارے میں شریعت سازی کے لیے آزاد چھوڑ دیا ہے۔ ان میں

سے جو دعویٰ بھی وہ کرتا ہے' وہ لازماً جھوٹ اور اللہ پر بہتان ہے۔

انسانی عمل میں حرام وحلال کا دائرہ بہت وسیع ہے' ان کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے' چاہے یہ عقائد کے متعلق ہوں یا عبادات سے' معاشرت سے متعلق ہوں یا معیشت وتجارت سے تعلق رکھتے ہوں۔ مطلب یہ کہ زندگی میں قدم قدم پر مسلمان کے سامنے یہ بات آتی ہے کہ یہ کام حرام یا حلال ہے؟ اور اللہ اور اس کے رسول کا اس بارے میں کیا حکم ہے؟

نبی کریم ﷺ نے سائل کے جواب پر جنت میں داخل ہونے کے لیے کم از کم جو شرط بتائی' وہ یہ ہے کہ مسلمان فرض نمازوں اور روزوں کا پابند ہو' حلال وحرام کی پہچان اور تمیز رکھتا ہو اور اس پر عمل پیرا ہو' ایسا آدمی جنت میں جائے گا۔ یہ معیار سامنے رکھ کر اپنے معاشرے پر نظر ڈالتے ہیں تو کتنے مسلمان اس معیار پر پورے اُترتے ہیں اور کتنے ایسے ہیں جو اس سے خالی ہیں؟ پاکستانی معاشرے میں ایک اندازے کے مطابق 20 فیصد لوگ نماز پڑھتے ہیں اور اتنی ہی تعداد روزہ داروں کی ہے پھر حرام وحلال کی تمیز رکھنے والے تو اس سے بھی کم ہیں اور حلال کھانے والے اور حرام سے بچنے والے تو اور بھی کم' جبکہ قرن اوّل یعنی نبی ﷺ اور صحابہ کے دور میں شاید ہی ایسے لوگ ملتے ہوں جو فرائض ادا نہ کرتے ہوں اور حرام وحلال میں تمیز نہ کرنے والے بھی آٹے میں نمک کے برابر بھی شاید نہ ہوں۔

آج مسلمانوں میں ایک اور رجحان جو زیادہ نظر آتا ہے' وہ سنن غیر مؤکدہ' مستحبات' مباحات اور مندوبات پر زور اور شدت سے ان کی ادائیگی کرنا جبکہ فرائض وواجبات اور سنن مؤکدہ سے غفلت پہلو تہی اور دُوری ہے۔ دین کی اہم اور بنیادی باتوں سے غفلت' عدم ادائیگی اور لاپرواہی لیکن غیر اہم باتوں پر شدت اختیار کرنا جو دینِ اسلام کی حقیقت' مزاج اور فلسفے کے مطابق نہیں ہے۔

اسلام میں نوافل:

اسلام میں نوافل (نفل کی جمع) سنتیں اور مستحبات بھی اپنا مقام ومرتبہ اور وزن رکھتے ہیں۔ یہ بات قرآن مجید' حدیث شریف اور اجماع اور تعامل اُمت سے واضح ہوتی ہے۔

اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے یہ مقرر کیے ہیں تو ضرور ان کے پیچھے کتنے ہی مقاصد اور فائدے ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

(الف) ان کی ادائیگی عام طور پر فرضوں کے تتمے اور تکمیل کے لیے ہوتی ہے یعنی فرضوں کی ادائیگی میں جو کوتاہی، کمی اور نقص رہتا ہے، وہ نفلوں اور سنتوں کے ادا کرنے سے پورا ہو جاتا ہے اور فرض مکمل ہو جاتا ہے۔

(ب) انسان سے جو چھوٹی بڑی خطائیں، غلطیاں اور بھول چوک ہو جاتی ہے، ان کے لیے یہ زائد عمل کفارے اور تلافی کا سبب بن جاتے ہیں جیسے قرآن مجید میں ارشاد ہے:

اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّئَاتِ. (هود ۱۱:۱۱۴)

''بے شک نیکیاں بُرائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔''

(ج) فرض سے زائد یہ عبادتیں مومن کے مرتبے اور درجات بڑھانے کا سبب بنتی ہیں اور ان کے ذریعے بندہ اعلیٰ درجات کو پہنچ جاتا ہے۔

(د) ان نیکیوں اور عملوں کی وجہ سے بندہ اجر و ثواب زیادہ سے زیادہ حاصل کر لیتا ہے۔

(ہ) نوافل اور سنن تقرب الی اللہ (اللہ کے حضور قربت) کا وسیلہ ہوتے ہیں۔

ایک حدیث میں یہی بات آئی ہے کہ بندہ نوافل کے ذریعے سے مجھ سے قریب ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کی پوری زندگی اللہ کی رضا کے مطابق بن جاتی ہے۔

(و) یہ حضورِ اکرم ﷺ سے محبت کرنے اور آپ کی شفاعت حاصل کرنے کا وسیلہ ہیں، مومن جس قدر سنت پر عمل کرے گا، اتنا ہی آپ ﷺ سے تعلق اور محبت بڑھتی جائے گی اگر کوئی شخص نوافل و سنن کی پابندی ترک کر دے گا تو ان مذکورہ بالا تمام بھلائیوں اور نیکیوں سے محروم ہو جائے گا اور پھر آہستہ آہستہ فرضوں کا تارک بن جائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور تابعین حضرات اور دوسرے بزرگوں نے نوافل و سنتیں اس طرح پابندی اور ہمیشگی سے ادا کیے جس طرح فرائض ادا کیے بلکہ یہ حضرات تو فرضوں، سنتوں اور نفلوں کے درمیان فرق بھی نہیں کرتے تھے۔ نبی ﷺ نے سائل کے جواب میں نوافل اور سنن کا بیان نہیں فرمایا تا کہ سائل کو مسئلہ معلوم ہو اور اسلام میں آسانی،

رخصت اور سہولت کا جو پہلو ہے، سامنے آئے اور ان کا لازمی نہ ہونا بھی معلوم ہو۔ نیز اسلام کا ابتدائی دور تھا جس میں لوگوں سے آسانی سہولت اور یسر کا برتاؤ کرنا تھا تاکہ وہ لوگ اسلام سے نہ بدکیں اور اسے مشکل نہ سمجھیں۔ حدیث سے واعظین اور ناصحین کے لیے بھی رہنمائی ہے یہ حضرات کس طرح لوگوں کو بشارت دیں اور اسلام کے بنیادی اعمال وفرائض کی پابندی پر آمادہ کریں اور رغبت دلائیں۔

حدیث نمبر 23

نیکیوں کے انبار

عَنْ أَبِی مَالِکٍ الْحَارِثِ بْنِ عَاصِمٍ الْأَشْعَرِیِّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْإِیْمَانِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَأُ الْمِیْزَانَ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَآنِ اَوْ تَمْلَأُ مَابَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ، وَالصَّلٰوةُ نُوْرٌ وَالصَّدَقَةُ بُرْهَانٌ وَالصَّبْرُ ضِیَاءٌ وَالْقُرْاٰنُ حُجَّةٌ لَّکَ أَوْ عَلَیْکَ کُلُّ النَّاسِ یَغْدُوْ فَبَائِعٌ نَفْسَهٗ فَمُعْتِقُهَا أَوْ مُوْبِقُهَا." (رواہ مسلم)

"حضرت ابو مالک حارث بن عاصم اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "طہارت نصف ایمان ہے، الحمدللہ میزان کو بھر دیتا ہے، سبحان اللہ اور الحمدللہ آسمان اور زمین کے درمیانی حصے کو بھر دیتے ہیں" یا یہ فرمایا کہ "ان میں سے ہر ایک کلمہ آسمان اور زمین کے درمیان کو بھر دیتا ہے۔ نماز نور ہے، صدقہ برہان و دلیل ہے، صبر روشنی ہے اور قرآن تمہارے حق میں یا تمہارے خلاف حجت ہے۔ انسان کی صبح اس حالت میں ہوتی ہے کہ وہ اپنے نفس کا سودا کرتا ہے پھر یا تو اسے آزاد کرالیتا ہے یا اسے ہلاک کر دیتا ہے۔"

تشریح:

یہ حدیث بھی ان بنیادی احادیث میں سے ہے جن میں اسلام کی اصولی تعلیم بیان کی گئی ہے اس میں انسانی زندگی کے مختلف گوشوں سے واسطہ رکھنے والے کتنے ہی اسلامی

احکام کو بیان کیا گیا ہے۔ اس بناء پر امام نوویؒ نے اسے ایک جامع حدیث کی حیثیت سے اپنی اربعین میں درج کیا ہے۔ اس حدیث کی مختصر تشریح بیان کی جاتی ہے۔

(۱) ''طہارت نصف ایمان ہے'' طہارت کا کلمہ اسلامی اصطلاح میں بڑے وسیع معانی رکھتا ہے۔ دوسری کسی زبان میں کوئی ایسا کلمہ نہیں ہے جو اس کے مفہوم کو ادا کر سکے اسی بناء پر علماء نے طہارت کے معنی کو عام رکھا ہے جیسے دل کی طہارت، جان و جسم کی طہارت اور کپڑوں کی طہارت وغیرہ یعنی اعتقادات، عبادات اور اعمال کو شرک، ریا اور اخلاقی بیماریوں اور برائیوں سے پاک رکھنا، طہارت کے بارے میں امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ دل کو شرک، کینے، حسد، کھوٹ اور دغا وغیرہ دیگر تمام اخلاقی بیماریوں سے پاک رکھنا، اس تشریح کے مطابق شہادت کا کلمہ پڑھنے سے آدھا ایمان حاصل ہو جاتا ہے اور آدھا ایمان دل کو اخلاقی بیماریوں سے پاک رکھنے سے حاصل ہوتا ہے۔

بعض علماء نے لفظ ایمان سے مراد نماز لی ہے جیسے ارشادِ باری ہے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ اِيمَانَكُمْ. (البقرہ۲:۱۴۳)

''اور اللہ تمہاری نمازیں ضائع کرنے والا نہیں ہے۔''

طہارت کا نماز میں بڑا حصہ ہے جیسے جسم، جگہ اور کپڑوں کی طہارت فرض ہے۔

بہر حال طہارت کو عام معنی میں لیا جائے تاکہ اس کا دائرہ وسیع رہے کیونکہ اسلام میں طہارت کی بڑی اہمیت ہے۔ ابتدائی وحی میں ارشاد ہے:

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ. (المدثر۷۴:۵)

''اور اپنا لباس پاک رکھو اور گندگی (بتوں) کو چھوڑ دو۔''

چنانچہ اسلام اپنے پیروکاروں کو ذہنی، جسمانی، اخلاقی، تمدنی، تہذیبی، معاشرتی اور روحانی ہر لحاظ سے پاک وصاف دیکھنا چاہتا ہے۔

(۲) ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ (کہنا) میزان کو زمین اور آسمان کے درمیان بھر دیتا ہے۔''

ان کلمات میں اللہ کی توحید، حمد اور ثنا کی ادائیگی اور شرک سے پاکیزگی بیان کی گئی ہے۔ یہ کلمات جب شعور، سمجھ، دل کے یقین اور یکسوئی سے کہے جائیں گے تو بڑے

اجروثواب کا سبب بنیں گے۔ قرآن وحدیث میں اعمال کے وزن کرنے اور تولنے کا بیان متعدد مقامات پر آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن اعمال کا وزن ہو گا اس وزن کی کیفیت کیا ہوگی' یہ اللہ ہی جانتا ہے۔ تاہم سائنسی علوم نے بہت سی غیر محسوس چیزوں کا وزن بتایا ہے جیسے ہوا' اس دن تول میں یہ کلمات بہت وزنی ہوں گے۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ جو احادیث عمل کی فضیلت ودرجات اور مقدار بیان کرتی ہیں اور مقدار گناتی ہیں اس سے علماء نے کثرت اور زیادتی مراد لی ہے۔ یہ تعداد یا مقدار تمثیل تقریبی کے طور بیان کی گئی ہے۔ نیز اس اجر اور ثواب کے حق دار وہ اشخاص ہوں گے جو اسلام کے بنیادی احکام پورے کریں جیسے فرائض واجبات کی ادائیگی کریں اور محرمات وممنوعات سے کنارہ کش ہوں اور حقوق العباد ادا کریں۔ ایسے اشخاص کے نوافل اور وظائف اور صدقات وخیرات اور دوسری نفلی نیکیوں کے اجزاء کو اسی حساب سے بڑھایا جائے گا اور نیکیوں کے انبار لگ جائیں گے۔

(۳) ''نماز نور ہے۔

یعنی نماز نمازی کے لیے دونوں جہانوں میں نور ہوگی۔ ابن دقیق العید کہتے ہیں کہ نماز بندے کو نیکی اور بھلائی کی طرف رہنمائی کرتی ہے جیسے اندھیرے میں نور (روشنی) انسان کو پھسلنے اور بھٹکنے سے بچاتا ہے' ایسے ہی نماز بھی برائیوں اور بے حیائیوں سے بچاتی ہے اسی طرح آخرت میں بھی نماز بندے کے لیے نور بن کر رہنمائی کرے گی۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے:

بَشِّرِ الْمَشَّائِيْنَ فِي الظُّلَمِ اِلَى الْمَسَاجِدِ بِالنُّوْرِ التَّام يَوْمَ الْقِيَامَةِ.

(الترمذی وابوداؤد)

''اندھیرے میں مسجدوں کی طرف کثرت سے جانے والوں کو قیامت کے دن مکمل نور کی خوش خبری دے دو۔''

نماز نمازی کے لیے دنیا وآخرت میں ظاہری اور باطنی طور پر نور ہوگی' خود نمازی کے منہ پر دنیا میں نماز کی وجہ سے نورانیت ورونق ہوتی ہے اور قیامت کے دن وضو والے عضاء پر نورانیت اور چمک ہوگی اور ان کے آگے نور پھیل رہا ہوگا۔

(۴) ''صدقہ (خیرات) برہان ودلیل ہے۔''

یعنی مالی صدقات صدقہ کرنے والے کے ایمان وصداقت پر دلیل ہیں کیونکہ مومن مال کی محبت پر اللہ کی محبت کو ترجیح دے کر اس کے وعدوں پر یقین کر کے صدقہ کرتا ہے اسی طرح جب آخرت میں مال کمانے اور اس کے خرچ کرنے کے بارے میں سوال کیا جائے گا تو صدقہ آگے بڑھ کر صدقہ کرنے والے کے ایمان واخلاص کی دلیل بن کر کھڑا ہوگا۔

(۵) ''صبر روشنی ہے۔''

شریعتِ مطہرہ میں صبر کا مفہوم ودائرہ بہت وسیع ہے۔ چنانچہ صبر یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت پر استقامت کے ساتھ قائم رہنا' اس کی نافرمانی سے بچنا اور تکلیفوں اور مصیبتوں کو ہمت سے برداشت کرنا' ان تینوں قسموں کے مجموعے کو اسلام میں صبر کہا جاتا ہے۔

حدیث کے اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ نفس کی خواہشات کو چھوڑ کر اللہ کی بندگی میں ثابت قدمی سے قائم رہنا' معصیت ونافرمانی سے بچنا اور پریشانیوں اور مصیبتوں کو رب تعالیٰ کی قضا وقدر کے مطابق سمجھتے ہوئے صبر کرنا اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کرنے سے بچنا ایسی روشنی ہے جس کی وجہ سے بندہ گناہوں کے اندھیرے سے دُور رہتا ہے اور کفر وشرک کی گمراہی سے محفوظ رہتا ہے۔

(۶) ''قرآن تمہارے حق میں یا تمہارے خلاف حجت ہے۔''

جس شخص نے قرآن کے تمام حقوق ادا کیے جیسے اس پر ایمان لانا' اسے پڑھنا' اسے سمجھنا اور اس میں غور وفکر اور تدبر وتفکر کرنا' اپنی زندگی کے تمام معاملات میں اس پر عمل کرنا اور اسے دوسرے انسانوں تک پہنچانا جس شخص نے یہ تمام حقوق ادا کیے تو قرآن مجید اس کی پشت پناہ ہوگا اور اللہ کے حضور میں اس کی شفاعت کرنے والا ہوگا لیکن جس شخص نے قرآن کے یہ حقوق ادا نہ کیے بلکہ اس سے روگردانی کی' اس پر ایمان نہ لایا' ایمان لا کر اسے نہ پڑھا' اس پر عمل نہ کیا' اسے دوسروں تک نہ پہنچایا تو قرآن ایسے شخص کے خلاف قیامت کے دن فریادی بن کر کھڑا ہوگا اور اسے سزا دلائے گا۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے کہا ''یقین کرو کہ یہ قرآن تمہارے لیے اجر کا ذریعہ بھی ہو سکتا ہے اور عذاب کا سبب بھی بن سکتا ہے' لہٰذا تم قرآن کی تابعداری کرو' یہ نہ ہو کہ قرآن

(تمہارا مخالف ہو کر) تمہارے پیچھے لگے کیونکہ جو شخص قرآن کی تابعداری کرے گا تو وہ اسے جنت کے باغوں میں پہنچائے گا اور قرآن جس کے پیچھے لگ جائے تو اسے گردن سے پکڑ کر دوزخ میں گرا دیتا ہے۔"

(۷) "ہر انسان کی صبح اس حالت...... ہلاک کر دیتا ہے۔"

یہ دنیا عمل کا میدان ہے' سو ہر انسان اس میں عمل کرتا رہتا ہے اور کوئی بھی فارغ نہیں بیٹھتا۔ عمل کرنے والے انسانوں کے دو طبقے اور درجے ہیں۔ ایک طبقہ ان لوگوں کا ہے جو اپنی تگ ودو کرنے اور زندگی گزارنے میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور آخرت کی کامیابی کو اپنے سامنے رکھتا ہے اور اپنے تمام کام کاج اللہ کے احکام کے مطابق سرانجام دیتا ہے۔ اگرچہ دونوں طبقے اپنی روزی کمانے کے لیے بھاگ دوڑ کرتے ہیں لیکن دونوں کے عمل وکردار میں نظریاتی' ذہنی سوچ اور نقطہ نظر کا بہت فرق ہوتا ہے اسی فرق کو اس حدیث میں نفس کا سودا کرنا' اسے بیچنا اور آزاد کرالینا اپنے سامنے رکھ کر کام کرتا ہے۔ ایسا شخص اپنی جان کو اللہ کے عذاب سے آزاد کرالیتا ہے اس کے برخلاف دوسرا شخص اپنی تمام بھاگ دوڑ ایک غیر ذمہ دار اور آزاد ہو کر اپنے نفس کے غلام کی حیثیت سے کرتا ہے' کسی کام میں بھی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کو پیش نظر نہیں رکھتا اور حرام وحلال' جائز وناجائز اور حق وناحق کے تصور سے خالی ہوتا ہے۔ ایسا شخص اپنی جان کو ہلاک کر دیتا ہے' یہ ہلاکی کبھی تو دنیاوی زندگی میں ہی سامنے آجاتی ہے لیکن اگر اس زندگی میں مشیتِ خداوندی سے سامنے نہ آئے تو آخرت میں بہرحال ضرور دیکھے گا وہاں پر تمام اعمال کا انجام دیکھنا ہوگا۔

انسان کو سوچنا چاہیے کہ جان ایک مرتبہ ملتی ہے' عمر ایک ہی ہے اور اس دنیا میں بار بار آنا نہیں ہے' لہٰذا وہ سوچ سمجھ کر زندگی گزارے اور اپنے آپ کو ہلاک نہ کرے اور اپنا آخرت کا گھر جو دائمی وابدی ہے' برباد نہ کرے اور کوشش کرے کے دونوں جہانوں کی بھلائیاں اور نیکیاں سمیٹ لے۔

حدیث نمبر 24

توحید

عَنْ أَبِیْ ذَرِّ الْغِفَارِیِّ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ فِیْمَا یَرْوِیْهِ عَنْ رَبِّهٖ عَزَّوَجَلَّ أَنَّهٗ قَالَ: ”یَا عِبَادِیْ إِنِّیْ حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلٰی نَفْسِیْ وَجَعَلْتُهٗ بَیْنَکُمْ مُحَرَّمًا فَلَا تَظَالَمُوْا، یَاعِبَادِیْ کُلُّکُمْ ضَالٌّ إِلَّا مَنْ هَدَیْتُهٗ فَاسْتَهْدُوْنِیْ أَهْدِکُمْ، یَا عِبَادِیْ کُلُّکُمْ جَائِعٌ إِلَّا مَنْ أَطْعَمْتُهٗ فَاسْتَطْعِمُوْنِیْ أُطْعِمْکُمْ، یَا عِبَادِیْ کُلُّکُمْ عَارٍ إِلَّا مَنْ کَسَوْتُهٗ فَاسْتَکْسُوْنِیْ أَکْسُکُمْ، یَاعِبَادِیْ اِنَّکُمْ تُخْطِئُوْنَ بِاللَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَأَنَا أَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا فَاسْتَغْفِرُوْنِیْ أَغْفِرْلَکُمْ، یَاعِبَادِیْ إِنَّکُمْ لَنْ تَبْلُغُوْا ضُرِّیْ فَتَضُرُّوْنِیْ وَلَنْ تَبْلُغُوْا نَفْعِیْ فَتَنْفَعُوْنِیْ، یَاعِبَادِیْ لَوْ أَنَّ أَوَّلَکُمْ وَآخِرَکُمْ وَإِنْسَکُمْ وَجِنَّکُمْ کَانُوْا عَلٰی أَتْقٰی قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِّنْکُمْ مَا زَادَ ذَالِکَ فِیْ مُلْکِیْ شَیْئًا، یَاعِبَادِیْ لَوْ أَنَّ أَوَّلَکُمْ وَآخِرَکُمْ وَإِنْسَکُمْ وَجِنَّکُمْ کَانُوْا عَلٰی أَفْجَرِ قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِّنْکُمْ مَانَقَصَ ذَالِکَ مِنْ مُلْکِیْ شَیْئًا، یَاعِبَادِیْ لَوْ أَنَّ أَوَّلَکُمْ وَآخِرَکُمْ وَإِنْسَکُمْ وَجِنَّکُمْ قَامُوْا فِیْ صَعِیْدٍ وَاحِدٍ فَسَأَلُوْنِیْ فَأَعْطَیْتُ کُلَّ وَاحِدٍ مَسْأَلَتَهٗ مَا نَقَصَ ذٰلِکَ مِمَّا عِنْدِیْ إِلَّا کَمَا یَنْقُصُ الْمِخْیَطُ إِذَا أُدْخِلَ الْبَحْرَ، یَا عِبَادِیْ إِنَّمَا هِیَ أَعْمَالُکُمْ أُحْصِیْهَا لَکُمْ ثُمَّ أُوَفِّیْکُمْ إِیَّاهَا، فَمَنْ وَجَدَ خَیْرًا فَلْیَحْمَدِ اللهَ وَمَنْ وَجَدَ غَیْرَ ذٰلِکَ فَلَا یَلُوْمَنَّ إِلَّا نَفْسَهٗ.“ (مسلم)

''حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ عزوجل سے روایت کرتے ہوئے فرمایا' اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

''اے میرے بندو! میں نے اپنے نفس پر بھی ظلم حرام کیا ہے اور تمہارے درمیان بھی ایک دوسرے پر ظلم کرنا حرام کر دیا ہے لہٰذا تم آپس میں ایک دوسرے پر ظلم وزیادتی نہ کرو۔ اے میرے بندو! تم سب بھولے بھٹکے ہوئے ہو سوائے اس کے جسے میں ہدایت دوں لہٰذا مجھ سے ہی ہدایت طلب کرو' میں تمہیں ہدایت دوں گا۔ میرے بندو! تم سب بھوکے ہو سوائے اس کے جس کو میں کھلاؤں لہٰذا مجھ سے کھانا مانگو' میں تم کو کھلاؤں گا۔ میرے بندو! تم سب برہنہ ہو مگر جسے میں پہنا دوں لہٰذا مجھ سے پہننے کے لیے مانگو' میں تم کو پہناؤں گا۔ میرے بندو! بلاشبہ تم رات دن غلطیاں کرتے ہو اور میں تمام گناہ معاف کرتا رہتا ہوں لہٰذا مجھ سے گناہوں کی معافی مانگو' میں تم کو بخش دوں گا۔ میرے بندو! تم ہرگز ہرگز اس لائق نہیں کہ مجھے کوئی نقصان پہنچا سکو اور نہ اس لائق ہو کہ مجھے کوئی نفع پہنچا سکو۔ اے میرے بندو! بلاشبہ اگر سارے اوّلین وآخرین انسان وجن دنیا کے سب سے متقی شخص کی خصلت پر ہو جائیں تو بھی میرے ملک میں زیادتی نہیں آئے گی۔ میرے بندو! بلاشبہ اگر سارے اوّلین وآخرین انسان وجنات دنیا کے سب سے زیادہ فاجر شخص کی خصلت پر ہو جائیں تو بھی میری ملک میں کوئی کمی نہیں آئے گی اور اگر سارے کے سارے انسان وجنات ایک میدان میں کھڑے ہو کر مجھ سے مانگیں اور میں ہر انسان کو اس کی خواہش کے بقدر دے دوں تو بھی میرے خزانے میں سے اس قدر جائے گا جیسے ایک سوئی کو سمندر میں ڈبو کر باہر نکال لیا جائے۔

میرے بندو! (آخرت میں) تمہارے اعمال ہی ہوں گے جن کو میں نے محفوظ کر رکھا ہے' میں ان کا پورا پورا اجر دوں گا جو اپنے عمل کا اچھا بدلا پائے' اسے چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد کرے اور جو اپنے عمل کا اس کے علاوہ دوسرا بدلہ پائے' اسے چاہیے کہ اپنے آپ کو ہی ملامت کرے۔

تشریح:

یہ ایک بڑی اہم حدیث ہے جو دینِ اسلام کے بنیادی عقیدے توحید اور اللہ تعالیٰ کی اہم صفات کی وضاحت کرتی ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کی مالکیت' ربوبیت (پالن ہاری) اور بندوں کی بے بسی' عاجزی اور محتاجی کو بیان کرتی ہے اس لیے علماء نے کہا ہے کہ یہ حدیث اپنے بچوں کو سنانی چاہیے اس کی مختصر تشریح کی جاتی ہے:

(۱) ''میرے بندو! میں نے اپنے اوپر...... سو تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر کسی پر ظلم کرنا حرام کیا ہے لہٰذا جو شخص جیسے عمل کرے گا اس کے ہاں ویسا ہی بدلہ پائے گا اور جتنی سزا کا حق دار ہوگا' اتنی ہی سزا دی جائے گی اور کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں ہوگا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا. (الکہف ۱۸:۴۹)

''اور انہوں نے جیسے عمل کیے ہیں' وہ موجود پائیں گے اور تمہارا رب کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔''

اور ارشاد ہے:

وَاِنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ. (آل عمران ۳:۱۸۲)

''اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر کسی قسم کا ظلم کرنے والا نہیں ہے۔''

وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلاً. (النساء ۴:۴۹) اور ان پر ذرّہ برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔

اس کے بعد رب تعالیٰ نے فرمایا ''اور تمہارے درمیان بھی ایک دوسرے پر ظلم کرنے کو میں نے حرام کیا ہے سو تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔'' اس لیے کہ انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ اور اس کا نائب ہے سو اس میں اپنے آقا کی طرح رحم' عدل اور انصاف ہونا چاہیے' بے انصافی اور ظلم وزیادتی سے دُور رہنا چاہیے اور جس ذات کی اسے خلافت ملی ہے اس کے رحم وعدل والی صفت اور دیگر صفات کو اپنانا چاہیے۔

(۲) ''میرے بندو! تم سب اپنی ذات کے لحاظ سے بھٹکے ہوئے ہو...... میں تمہیں ہدایت کروں۔''

یعنی تم اپنے طور پر اپنی عقل لڑا کر اور میری ہدایت سے بے پرواہ ہو کر یا منہ موڑ کر اپنے لیے ہدایت نہیں پا سکتے۔ ہدایت حاصل کرنے' کامل انسان بننے' اس دنیا میں آنے کے مقاصد کی تکمیل و تحسین کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی طرف متوجہ ہو' اللہ سے ہدایت طلب کرے اور اللہ کے فرستادہ بندوں کے توسط سے ہدایت حاصل کرے۔ ایسے ہی بندوں کو اللہ راہِ راست دکھاتا ہے' رہنمائی کرتا ہے اور ہدایت عطا کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص الخاص بندے سید المرسلین ﷺ کے بارے میں فرمایا:

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى. (الضحیٰ ۹۳:۷)

''اور تجھے گم کردہ راہ پایا پھر رہنمائی کی''

جب نبی الاولین والآخرین کو اللہ کی رہنمائی وہدایت کی ضرورت ہے تو دوسرے تمام انسان تو بطریق اولیٰ اس کے محتاج ہیں اس حقیقت کو ان مذکورہ بالا جملوں میں بیان فرمایا' حقیقی ہدایت وسعادت کی تو صرف وہی بخشش کرتا ہے۔

(۳) ''میرے بندو! تم سب .... کہ میں تمہیں پہناؤں۔''

ان جملوں اور فقروں میں بندوں کی بے بسی' حاجت مندی اور لاچاری بیان کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ تمہاری تمام ضرورتیں' حاجتیں اور دین ودنیا کی بھلائیاں اور کامیابیاں اللہ تعالیٰ کے بس میں اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں' وہی حقیقی داتا ہے اور وہی سب کو دینے والا ہے اور وہ کسی کو محروم کر دے تو کوئی اسے دینے والا نہیں ہے جب حقیقت یہ ہے تو پھر اسی سے طلب کرنا اور مانگنا چاہیے۔

ارشادِ نبوی ہے:

وَاِذَا سَئَلْتَ فَاسْئَلِ اللّٰهَ.

''جب سوال کرو تو اللہ سے ہی سوال کرو۔''

اس حدیث میں بندوں کے محتاج ہونے کی حقیقت بتانے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی بتایا گیا ہے کہ بندے مجھ سے ہی کھانے پینے کے لیے مانگیں اور مجھ سے ہی پہننے کے لیے پوشاک طلب کریں۔

(۴) میرے بندو! تم دن رات.........................بخشوں گا۔"

گناہوں کا بخشنے والا صرف اللہ ہی ہے سو جسے وہ بخش دے اس کے لیے نجات ہے اور جسے نہ بخشے اس کے لیے ہلاکی و بربادی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اس بات کو اس طرح بیان کیا:

وَاِنْ لَّا تَغْفِرْلِیْ وَتَرْحَمْنِیْٓ اَکُنْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ. (ھود۱۱:۴۷)

"اور (اے رب) اگر تو مجھے نہیں بخشے گا اور مجھ پر رحم نہیں کرے گا تو میں گھاٹے والوں میں سے ہو جاؤں گا۔"

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' شیطان نے درگاہ خداوندی میں عرض کیا" یارب مجھے تیری عزت کی قسم! تیرے بندوں کو اس وقت تک گمراہ کرتا رہوں گا جب تک ان کی روح ان کے جسموں میں ہوگی۔" اس کے جواب میں رب تعالیٰ نے فرمایا" مجھے قسم ہے اپنی عزت وجلال اور اعلیٰ شان کی کہ جب تک میرے بندے مجھ سے بخشش چاہتے (استغفار کرتے) رہیں گے' میں بخشتا رہوں گا۔" (مشکوٰۃ)

زیر مطالعہ حدیث کے الفاظ (یَاعِبَادِیْ اِنَّکُمْ تُخْطِئُوْنَ...... اِغْفِرْلَکُمْ) میں اسی حقیقت کو نمایاں بیان کیا گیا ہے۔

(۵) "میرے بندو! اگر تمہارے گناہ.........................کوئی کمی نہیں آئے گی۔"

ان جملوں میں اللہ تعالیٰ کی بے نیازی' بے پرواہی اور غنائی کا بیان کیا گیا ہے درحقیقت مخلوق کی اطاعت' فرماں برداری اور نیکی سے اللہ کی حکومت اور بادشاہی میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا اور نہ انسانوں کی نافرمانی اور گناہوں سے اس کی ملک میں کوئی کمی ہوتی ہے' وہ اپنی خالقیت' مالکیت اور بادشاہی میں اکیلا وحدہ لاشریک ہے' وہ کسی کا محتاج نہیں ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔

نیک ہونے اور نیکی کرنے سے بندوں کا اپنا دنیا اور آخرت کا بھلا ہے اور بدی کرنے اور بُرا ہونے سے ان کا ہی دنیا اور آخرت کا نقصان' تباہی اور بربادی ہے' لہٰذا انسان اس کی اطاعت کرے تو یہ اللہ تعالیٰ پر کوئی احسان نہیں ہے لیکن اس کا اپنا بھلا ہے اس لیے اس پر مد کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

(۶) ''میرے بندو! اگر تمہارے پہلے والے.............. ڈبو کر نکالی جائے۔''

ان جملوں میں اللہ کے جود و سخا' اس کے وسیع خزانوں اور اس کے داتا ہونے کا بیان ہے اور اس کے ساتھ بندوں کو سوال کرنے اور مانگنے کی ترغیب بھی دینا ہے' اللہ تعالیٰ کے خزانے اتنے بے پایاں ہیں کہ انہیں سمجھ نہیں سکتا۔ تم تھوڑا سا قوت (انرجی) پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ہر دور میں اللہ کے خزانوں میں سے قوت کی مختلف قسمیں اور صورتیں سامنے آتی رہی ہیں' انسان کو جب اس کی ضرورت پیش آئی اور اس نے تلاش کیا' اسے کتنی ہی قسمیں معلوم ہوئیں جو اس کی ضرورت پوری کرتی ہیں۔ یہ سلسلہ چق ماق اور آگ سے شروع ہو کر لکڑی' کوئلے' تیل' بجلی اور گیس سے ہوتے ہوئے شمسی اور ایٹمی توانائی تک جا پہنچا ہے اور یہ آخری توانائیاں نہ ختم ہونے والی ہیں۔ ایک حدیث میں ہے:

لا يَغِيضُهَا نَفَقَةٌ سَحَاءِ الَّيْلَ وَالنَّهَار أَرَئَيْتُمْ مَا اَنْفَق خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فَاِنَّهُ لَمْ يَغُضْ مَافِيْ يَمِيْنِهِ. ( )

''اللہ کے دونوں ہاتھ پر ہیں' دن رات کا مسلسل خرچ اسے کم نہیں کرتا تم دیکھتے نہیں کہ جو کچھ آسمان اور زمین میں پیدا کرنے سے لے کر خرچ کیا ہے اس نے اس کے داہنے ہاتھ کی نعمتوں کو ختم نہیں کیا۔''

مطلب یہ ہے کہ ہر چیز کی ایجاد پر وہ قادر المطلق ہے' کسی چیز کو بھی پیدا کرنے سے وہ عاجز اور بے بس نہیں ہے' اس کی کائنات میں ممکنات کے لیے کوئی حد اور انتہا نہیں ہے۔

(۷) میرے بندو! (آخرت میں) تمہارے.............. ملامت کرنی چاہیے۔''

آخرت میں اللہ کے ہاں اعمال کی قدر و قیمت ہوگی اور نجات کا دارومدار زیادہ تر اعمال پر ہوگا۔ قرآن مجید کی سینکڑوں آیات اور صحیح احادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قیامت کے دن اعمال کی بنیاد پر فیصلے ہوں گے سو جس کے عمل اچھے ہیں' اسے آج بھی اور اس دن بھی شکر ادا کرنا چاہیے لیکن جس کے عمل صحیح نہ ہوں اور اسے اپنے آپ کو ملامت کرنا چاہیے' اللہ تعالیٰ کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے' اصل قصور اور کوتاہی اس کی اپنی ہے کہ دنیا میں اسے عمل کے لیے موقع ملا تھا لیکن اس میں اس نے عمل کیوں نہیں کیا اور کیوں غفلت کر کے اپنی عاقبت برباد کی۔

حدیث نمبر 25

اجر وثواب کی راہیں

عَنْ أَبِی ذَرٍّ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ أیضاً: "أَنَّ نَاسًا مِنْ أَصْحَابِ رَسُوْلِ اللہِ ﷺ قَالُوا لِلنَّبِیِّ ﷺ: یَارَسُوْلَ اللہِ ذَھَبَ أَھْلُ الدُّثُوْرِ بِالْأُجُوْرِ، یُصَلُّوْنَ کَمَا نُصَلِّیْ وَیَصُوْمُوْنَ کَمَا نَصُوْمُ وَیَتَصَدَّقُوْنَ بِفُضُوْلِ أَمْوَالِھِمْ قَالَ: أَوَ لَیْسَ قَدْ جَعَلَ اللہُ لَکُمْ مَا تَصَدَّقُوْنَ إِنَّ بِکُلِّ تَسْبِیْحَۃٍ صَدَقَۃً، وَکُلِّ تَکْبِیْرَۃٍ صَدَقَۃً، وَکُلِّ تَحْمِیْدَۃٍ صَدَقَۃً وَکُلِّ تَھْلِیْلَۃٍ صَدَقَۃً، وَأَمْرٌ بِالْمَعْرُوْفِ صَدَقَۃً، وَنَھْیٌ عَنْ مُنْکَرٍ صَدَقَۃٌ وَفِیْ بُضْعِ أَحَدِکُمْ صَدَقَۃٌ، قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللہِ أَیَأْتِیْ أَحَدُنَا شَھْوَتَہُ وَیَکُوْنُ لَہُ فِیْھَا أَجْرٌ؟ قَالَ أَرَأَیْتُمْ لَوْ وَضَعَھَا فِیْ حَرَامٍ أَکَانَ عَلَیْہِ وِزْرٌ؟ فَکَذٰلِکَ إِذَا وَضَعَھَا فِی الْحَلَالِ کَانَ لَہُ أَجْرٌ."

(رواہ مسلم)

"حضرت ابی ذرؓ سے روایت بھی ہے، آنحضرت ﷺ کے اصحاب میں سے چند نے آپ سے عرض کیا "یارسول اللہ! ﷺ اہلِ ثروت ودولت تو خوب اجر لے گئے جیسے ہم نماز پڑھتے ہیں، وہ بھی نماز پڑھتے ہیں اور جیسے ہم روزہ رکھتے ہیں، وہ بھی روزہ رکھتے ہیں۔ نیز وہ ضرورت سے زیادہ مال سے صدقہ بھی کرتے ہیں۔" آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "اللہ نے تم کو صدقہ کرنے کی استطاعت نہیں دی ہے۔ بلاشبہ ہر اللہ اکبر صدقہ ہے اور ہر الحمدللہ صدقہ

ہے اور ہر سبحان اللہ صدقہ ہے، ہر لا الہ الا اللہ صدقہ ہے اور نیکی کا حکم دینا اور بُرائی سے روکنا صدقہ ہے، تمہاری شرم گاہ کے استعمال کرنے میں بھی صدقہ ہے۔ صحابہ نے عرض کیا ''یارسول اللہ! ﷺ ہم میں سے کوئی شخص اپنی نفسانی خواہش پوری کرتا ہے تو کیا اسے اس میں بھی اجر ملے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا ''یہ بتاؤ اگر وہ اپنی شرم گاہ حرام جگہ استعمال کرتا ہے تو وہ گناہ کا مرتکب نہ مانا جاتا' اسی طرح وہ اسے حلال جگہ استعمال کرے گا تو اسے اجر وثواب ملے گا۔''

تشریح:

ایک اور روایت جو ابو ہریرہؓ نے بیان کی ہے کہ غریب مہاجرین نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ دولت مند، بلند درجے اور دائمی رہنے والی نعمتیں لے گئے۔ نبی ﷺ نے پوچھا کہ اس کا کیا سبب ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ ''ایسے ہی وہ نمازیں پڑھتے ہیں جیسے ہم پڑھتے ہیں، ایسے ہی روزے رکھتے ہیں جیسے ہم رکھتے ہیں اور وہ صدقہ وخیرات کرتے ہیں لیکن ہم نہیں کرتے، وہ غلام آزاد کرتے ہیں اور ہم نہیں کرتے۔'' یہ سُن کر آپ ﷺ نے فرمایا ''کیا میں تمہیں کوئی ایسا عمل نہ بتاؤں جس کے کرنے سے تم ان لوگوں کا درجہ حاصل کرلو گے جو تم سے پہلے گزرے ہیں اور تم ان لوگوں سے آگے نکل جاؤ گے جو تمہارے بعد آئے اور تم سے کوئی دولت مند افضل نہیں ہوگا؟ ہاں! یہ اور بات ہے کہ وہ بھی تمہارے جیسا عمل کرنے لگیں۔'' یہ سُن کر ان صحابہ نے عرض کیا کہ ''یارسول اللہ! ﷺ ضرور ارشاد فرمائیں (ہم عمل کریں گے)'' نبی ﷺ نے فرمایا ''ہر فرض کے بعد ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، ۳۳ مرتبہ الحمدللہ اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر کہا کریں۔''

یہ سُن کر غریب مہاجر بہت خوش ہوئے اور اس پر عمل کرنا شروع کر دیا لیکن چونکہ اس زمانے میں اپنی آخرت بنانے کے لیے ہر شخص میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا شوق تھا اس لیے مال داروں نے بھی یہ وظیفہ پڑھنا شروع کیا اس پر غریب مہاجر پھر نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ''ہمارے مال دار بھائیوں کو اس کی اطلاع ہوگئی اور یہ بات انہوں نے بھی شروع کر دی۔'' اس بات کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا:

ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ.

''یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہتا ہے عنایت کر دیتا ہے۔''

یہ دونوں حدیثیں ایک ہی مضمون کو بیان کرتی ہیں اور ایک دوسرے کی تائید اور وضاحت کرتی ہیں اس لیے دونوں کو ملا کر پڑھنے سے بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔

۱) اس حدیث سے صحابہ کرامؓ کی ایک صفت یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ حضرات آخرت کے ثواب اور وہاں بلند درجات حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش میں مصروف رہتے تھے اور قرآن مجید کی اس آیت پر عمل پیرا رہتے تھے۔

وَ سَابِقُوۡۤا اِلٰی مَغۡفِرَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ جَنَّۃٍ عَرۡضُھَا کَعَرۡضِ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ. (الحدید۵۷:۲۱)

''اپنے رب کی بخشش اور ایسی بہشت کی طرف آگے بڑھنے کے لیے دوڑو جس کا عرض آسمانوں اور زمین جیسا ہے۔''

دوسری طرف آج ہمارا رویہ یہ ہے کہ دنیا کے ساز و سامان اور مال و متاع کے حصول میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ درحقیقت مومن کی زندگی کا بڑا مقصد اپنی آخرت سدھارنا ہے نہ کہ یہ دنیا بسانا ہے، یہ تو عارضی وطن اور تھوڑی دیر سستانے کی جگہ ہے، یہاں کا ٹھاٹھ باٹھ اور مال متاع سب یہیں رہ جائے گا اور وہاں تو عمل کام آئیں گے اور یہی نجات کا ذریعہ ہوں گے۔

۲) اس حدیث سے مالی عبادت کی فضیلت معلوم ہوتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے، مال ان بندوں کے لیے بری چیز نہیں ہے جو آخرت کی فکر کرتے ہیں اور اچھے اعمال کے درپے رہتے ہیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

لَا بَالَ بِالۡغِنٰی لِمَنۡ اتَّقَی اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ.

''مال کا ہونا اس شخص کے لیے کوئی نقصان کی چیز نہیں ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔''

یعنی بندہ مال کمانے اور خرچ کرنے میں اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے احکام کا لحاظ رکھے تو وہ مال اس کے لیے فائدے کا باعث ہوگا اور اس کے ذریعے اپنی آخرت بنا

لے گا اور اللہ کی رضا حاصل کر لے۔

(۳) اللہ تعالیٰ کے ذکر اور تسبیح کی فضیلت معلوم ہوتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایسی مالی عبادتیں جو فرض اور واجب نہیں ہیں، ان کا مقابلہ ذکر واذکار سے کیا جائے تو ذکر کا درجہ بڑھ جاتا ہے تاہم مال والے حضرات ذکر کے ساتھ مالی صدقات بھی کریں تو وہ ذکر والوں سے یقیناً بڑھ جائیں گے۔

(۴) جس شخص کے پاس مال نہیں ہے لیکن وہ زیادہ نیکیاں کمانا چاہتا ہے اور خواہش کرتا ہے کہ مالی صدقہ جاریہ کی طرح کی نیکی کرے تو وہ شخص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (نیکیوں کا حکم دینے اور بُرائی سے روکنے) کا کام کرے اس کے اس عمل سے جو لوگ نیکی کی راہ پر آئیں گے اور جب تک نیکی کرتے رہیں گے، ان کی نیکیوں کا اجر وثواب اسے بھی ملتا رہے گا اسی لیے آپ ﷺ نے غریبوں کو یہ عمل بتایا اور اس طرف اشارہ کیا کہ مال دار اگر مالی خیر کے کام کر کے نیکیاں سمیٹتے ہیں تو تم دعوت وتبلیغ کا کام کر کے نیکیاں جمع کرو۔

(۵) حدیث کے آخر میں یہ فرمایا:

''تمہاری شرم گاہ کے استعمال کرنے میں بھی صدقہ ہے۔''

اس سے تھوڑا سا اندازہ کریں کہ اسلام کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور اس کا نظام کتنا جامع ہے کہ زندگی کے ہر چھوٹے بڑے معاملے پر نظر رکھتا ہے اور اس کے صحیح استعمال اور غلط استعمال پر ثواب وعتاب کا حکم دیتا ہے۔ شہوت پوری کرنا بظاہر ایک خالص دنیاداری اور نفس کا عمل نظر آتا ہے لیکن حضور ﷺ نے دلیل دے کر، قیاس کر کے اور عقلی استدلال سے سمجھایا کہ جب مومن کا نقطۂ نگاہ اور نیت صحیح ہو تو اس کام (جائز جماع) میں بھی اجر وثواب ہے۔

اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے محدث ابن دقیق العید لکھتے ہیں:

''مباح (جائز) عمل نیک نیت کے ساتھ کرنے سے عبادت بن جاتے ہیں اور اسی اصول پر جماع بھی عبادت ہو جائے گی۔ بشرطیکہ یہ بیوی کا حق ادا

کرنے اور اسے خوش رکھنے کی نیت سے کیا جائے یا نیک اولاد حاصل کرنے اور اپنے آپ کو یا اپنی بیوی کو بدکاری سے بچانے کی نیت سے کرے یا دوسرے ایسے ہی مقاصد ہوں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ ہر قسم کے مباح اعمال میں نیت نیک ہوتو **انما الاعمال بالنیات** (اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے) کے مطابق اجر وثواب کا سبب بن جاتے ہیں۔

حدیث نمبر 26

صدقہ کا جامع تصور

عَنْ أَبِی هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "كُلُّ سُلَامٰی مِنَ النَّاسِ عَلَيْهِ صَدَقَةٌ، كُلَّ يَوْمٍ تَطْلُعُ فِيْهِ الشَّمْسُ، تَعْدِلُ بَيْنَ اثْنَيْنِ صَدَقَةٌ وَتُعِيْنُ الرَّجُلَ فِیْ دَابَّتِهٖ فَتَحْمِلُهٗ عَلَيْهَا أَوْ تَرْفَعُ لَهٗ عَلَيْهَا مَتَاعَهٗ صَدَقَةٌ، وَالْكَلِمَةُ الطَّيِّبَةُ صَدَقَةٌ، وَبِكُلِّ خَطْوَةٍ تَمْشِيْهَا إِلَى الصَّلَاةِ صَدَقَةٌ، وَتُمِيْطُ الْأَذٰی عَنِ الطَّرِيْقِ صَدَقَةٌ"

(رواہ البخاری ومسلم)

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "انسان کے ہر جوڑ پر صدقہ لازم ہے، یہ ہر روز ہے جس میں سورج طلوع ہوتا ہے۔ تم دو انسانوں میں انصاف (صلح کراؤ) کرو، یہ صدقہ ہے، تم کسی آدمی کو اس کی سواری پر بٹھانے میں مدد کرو یا اس کا سامان اس پر اُٹھا کر رکھ دو، یہ صدقہ ہے۔ بھلی بات کہنا بھی صدقہ ہے، ہر وہ قدم جو نماز کے لیے اُٹھاؤ، صدقہ ہے اور راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹانا صدقہ ہے۔"

مسلم شریف کی ایک دوسری روایت میں ہے (تم میں سے) جو بھی صبح کو اُٹھتا ہے تو اس کے ہر عضو پر صدقہ واجب ہے۔ سبحان اللہ کہنا صدقہ ہے، الحمدللہ کہنا صدقہ ہے، لا الہ الا اللہ کہنا صدقہ ہے، اللہ اکبر کہنا صدقہ ہے، نیکی کا حکم کرنا صدقہ ہے اور بُرائی سے روکنا صدقہ ہے۔ ان کاموں کی جگہ دو رکعتیں چاشت کی پڑھنا کافی ہیں۔

اسلام میں نیکی اور صدقے کا تصور نہایت وسیع ہے اور اس کا دائرہ بہت سے

معاشرتی، اخلاقی اور تمدنی اور معاشی معاملات تک پھیلا ہوا ہے لیکن عام لوگ سمجھتے ہیں کہ صدقہ، خیرات اور نیکی یہ ہے کہ مسلمان رواجی عبادت اور کچھ مالی انفاق کر لے تو یہ نیکی اور صدقہ ہے اور یہ بھی کبھی کبھار کر لے تو کافی ہے۔ نبی ﷺ نے مذکورہ حدیث میں دو بنیادی باتیں ارشاد فرمائیں: ایک یہ کہ ہر انسان پر روزانہ کچھ نہ کچھ صدقہ اور معاشرتی نیکی کا کام کرنا لازم ہے لہٰذا اسے ہر وقت یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ میرے ہر ایک عضو پر اللہ کا شکر کرنا لازم ہے۔ صبح کو بیدار ہوتے ہی انسان یہ سوچے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ قیمتی عضو دیئے ہیں جو لاکھوں، کروڑوں اور اربوں کے ہیں اس لیے ان کا شکریہ ادا کرنا اور ان کی زکوٰۃ ادا کرنا چاہیے اس بات پر تھوڑا سا غور کریں تو حقیقت سامنے آئے گی کہ ہم میں سے کسی شخص کو کوئی مال دار آدمی کہے کہ میرے بیٹے کی آنکھ کسی حادثے میں ضائع ہوگئی ہے، تو سوتم اپنی ایک آنکھ ایک لاکھ میں فروخت کر دو تاکہ میں اپنے بیٹے کو لگواؤں' تو ہم میں سے کوئی انسان ایک لاکھ میں آنکھ فروخت کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوگا۔ ایسے کتنے ہی عضو ہمارے جسم میں موجود ہیں جن کی قیمت لاکھوں روپے ہے جیسا کہ آج کل ایک گردے کی قیمت تین چار لاکھ تک ہے لہٰذا ان تمام اعضاء کی نعمت کا شکر ادا کرنا اور ان کی زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے، نیکی کمانے، صدقہ اور خیرات کرنے کے کئی طریقے اور کام ہیں جنہیں اختیار کر کے آدمی نیکی کما سکتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ان طریقوں اور کاموں میں سے چند ایک کا نمونے اور مثال کے طور پر تذکرہ فرمایا ہے۔ اس سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اپنے جسم کی زکوٰۃ نکالنے کے لیے ہر شخص کو کوشش کرنی چاہیے اور کوئی نہ کوئی نیکی کا کام کر کے ثواب کمانا چاہیے۔

انفاق کے ذریعے نیکی کمانے کے لیے یہ سوچنا کہ میرے پاس پیسے ہوں تو پھر میں نیکی اور صدقہ وخیرات کروں پھر پیسے نہ ہونے کی صورت میں مایوس ہونا، پیسے والوں پر حسد وحسرت کرنا صحیح نہیں ہے' بلکہ ایسے لوگوں کو حضور ﷺ کی یہ حدیث سامنے رکھ کر نیکی، بھلائی اور خدمت کے کاموں میں حصہ لینا چاہیے۔ دو ناراض لوگوں میں صلح کرانا، جھگڑے اور فتنے کو ٹالنا، کسی کو حق لے کر دینا، بیوہ عورتوں اور بے سہارا لوگوں کی مدد کرنا، کسی پیدل چلنے

والے کو اپنی سواری پر بٹھا کر منزل پر پہنچانا، کسی معذور کو راستہ پار کرانا، کسی بھولے بھٹکے کو راستہ بتانا، کسی اُجڈ اور اَنجان کو کوئی کام سکھانا وغیرہ۔ یہ سب نیکی اور بھلائی کے کام ہیں، ان کاموں سے ایک طرف جسم کی زکوٰۃ ادا ہوتی ہے تو دوسری طرف اجر وثواب ملتا ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے آدمی سے راضی ہوتے ہیں۔

مسلم کی روایت میں یہ بھی ہے ''نیکی کا حکم کرنا اور برائی سے روکنا بھی صدقہ ہے''۔ یہ کام کارِ انبیاء ہے۔ انبیاء کرام کے دنیا میں آنے کا ایک مقصد نیکیاں پھیلانا اور برائی سے روکنا ہے اور اللہ کے دین کو دنیا میں نافذ کرنا اور اللہ کا کلمہ بلند کرنا ہے۔

زیرِ مطالعہ حدیث سے اسلام کا ایک جامع تصور سامنے آتا ہے۔ وہ یہ کہ اسلام صرف چند رسوم ورواج اور پوجا پاٹ کا نام نہیں ہے اور نہ ہی یہ جوگیوں، سادھوؤں اور راہبوں کا مذہب ہے کہ انسان مخلوق سے کٹ کر گوشہ نشین ہو کر بیٹھ جائے اور کسی کے کام نہ آئے بلکہ یہ ایک انقلابی نظام اور اجتماعی زندگی سے واسطہ رکھنے والا دین ہے' اس میں حقوق اللہ، حقوق العباد اور حقوق النفس کا مکمل نظام اور ضابطہ موجود ہے۔ کامل مومن وہ ہے جو یہ تینوں حقوق اعتدال اور توازن سے ادا کرے، اللہ تعالیٰ کے حقوق پوری طرح ادا کرے' پھر اپنی ذات اور جان وجسم کے حقوق ادا کرتے ہوئے اس کی دیکھ بھال کرے اور اس کی ضروریات پوری کرنے میں کوئی کوتاہی نہ کرے اور اس کے ساتھ حقوق العباد ادا کرے، اپنے عزیز واقارب، پڑوسیوں، دوستوں، ساتھیوں، غریبوں، مسکینوں، معذوروں اور حاجت مندوں کے حقوق ادا کرے۔ ان تینوں حقوق کی ادائیگی میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی ہے اور اجر وثواب ہے۔ ان حقوق میں توازن اور اعتدال قائم رکھنے والا ہی کامل مومن ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا کرے کہ یہ تینوں حقوق ادا کر کے نیکیوں سے جھولیاں بھریں اور دنیا اور آخرت کی نجات حاصل کریں۔

حدیث نمبر 27

نیکی اور بدی کی پرکھ

عَنِ النَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: ''اَلْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ وَالْاِثْمُ مَا حَاکَ فِیْ نَفْسِکَ وَکَرِھْتَ أَنْ یَطَّلِعَ عَلَیْہِ النَّاسُ.'' (رواہ مسلم)

وَعَنْ وَابِصَۃَ بْنِ مَعْبَدٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: ''أَتَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ فَقَالَ: جِئْتَ تَسْأَلُ عَنِ الْبِرِّ؟ قُلْتُ نَعَمْ، قَالَ: اِسْتَفْتِ قَلْبَکَ، اَلْبِرُّ مَا اطْمَأَنَّتْ اِلَیْہِ النَّفْسُ وَاطْمَأَنَّ اِلَیْہِ الْقَلْبُ، وَالْاِثْمُ مَا حَاکَ فِی النَّفْسِ وَتَرَدَّدَ فِی الصَّدْرِ، وَإِنْ أَفْتَاکَ النَّاسُ وَأَفْتُوْکَ'' حَدِیْثٌ حَسَنٌ' رَوَیْنَاہُ فِیْ مُسْنَدَیِ الْاِمَامَیْنِ أَحْمَدَ بْنِ حَنْبَلٍ وَالدَّارِمِیِّ بِاِسْنَادٍ حَسَنٍ.

''حضرت نواس بن سمعانؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا ''نیکی اچھے اخلاق کا نام ہے اور گناہ وہ ہے جو تمہارے من میں کھٹکے اور لوگوں کو اس کی اطلاع ہونا تجھے اچھا نہ لگے۔'' وابصہ بن معبدؓ نے کہا کہ ''میں نبی ﷺ کے پاس حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا ''تم نیکی کے بارے میں پوچھنے کے لیے آئے ہو؟'' میں نے کہا ''جی ہاں!'' اس پر آپ ﷺ نے فرمایا ''اپنے دل سے فتویٰ پوچھ، نیکی وہ ہے جس پر نفس (من) میں اطمینان ہو اور اس پر دل مطمئن ہو جائے اور گناہ وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹکے اور سینے میں بے چینی ہو اگرچہ (مفتی) لوگ تجھے (اس کے لیے جائز ہونے کا) فتویٰ

دے دیں۔"

تشریح:

اس حدیث میں برّ (نیکی) کا جو تصور دیا گیا، وہ بہت وسیع ہے اس میں حقوق اللہ، حقوق العباد اور حقوق النفس سب شامل ہو جاتے ہیں۔ امام نوویؒ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نیکی کی کتنی ہی قسمیں سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۱۷۷ میں بیان کی ہیں۔

"نیکی یہ نہیں ہے کہ تم آپنے چہرے مشرق کی طرف یا مغرب کی طرف کرو بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ، یومِ آخرت، ملائکہ، اللہ کی نازل کی ہوئی کتابوں اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رَشتے داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔ نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں تو اسے وفا کریں اور تنگی اور مصیبت کے وقت میں، حق اور باطل کی جنگ میں صبر کریں۔ یہ ہیں راست باز لوگ اور یہی متقی لوگ ہیں۔" (البقرہ۲: ۱۷۷)

ابن دقیق العید (م۷۰۲ھ) حسنِ اخلاق کی شرح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"حسنِ اخلاق سے مراد معاملات میں انساف کرنا، برتاؤ میں نرم خوئی کرنا، فیصلوں میں عدل اور احسان کرنا ہے۔"

اس کے بعد اس نے قرآن مجید کی درج ذیل سورتوں اور آیتوں کے حوالے دیتے ہوئے لکھا ہے کہ نیکی اور نیکی کے عمل معلوم کرنے کے لیے ان کا مطالعہ کیا جائے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی صفات کھول کر بیان کی ہیں: سورۂ انفال آیت ۳ سے ۴ تک، سورۂ توبہ آیت ۱۱۲، سورۂ المومنون آیات ۱ تا ۱۰ اور سورۂ فرقان آیات ۶۳ تا ۷۷۔ یہ حوالے دینے کے بعد یہ بزرگ لکھتے ہیں:

"جس شخص کو اپنے نیک ہونے اور اپنی نیکی کا جائزہ لینا ہو تو ان آیات کو معیار (کسوٹی) بنا کر اپنے آپ کو پرکھے اگر اس میں یہ تمام صفات ہیں تو مکمل حسن

خلق کا پیکر ہے اور اگر ان میں سے کوئی بھی نہیں ہے تو وہ مکمل سوء الخلق (بداخلاق) ہے۔ مومن کو چاہیے کہ ان میں سے جو صفات اس میں موجود ہیں، ان کی حفاظت کرے اور جو نہیں ہیں، ان کے حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہے اور یہ بھی کوشش کرے کہ آج کا دن کل گزرے ہوئے دن سے بہتر ہو۔''

اس حدیث میں دوسری اہم بات یہ بتائی گئی کہ اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے اس لیے ہر انسان کی فطرت میں ضمیر نام کا ایک قاضی رکھا گیا ہے۔ یہ قاضی یعنی ضمیر اگر ماحول، بداعمالیوں اور بدکرداریوں کی وجہ سے مرا نہیں ہے تو ہر انسان کو کوئی کام کرنے سے پہلے بتا دیتا ہے کہ یہ کام اچھا ہے یا بُرا ہے، نیکی کا ہے یا بدی کا اور ثواب کا باعث بنے گا یا عذاب کا سبب ہوگا' لہٰذا انسان باہر کے مفتیوں سے پوچھنے سے پہلے اپنے اندر کے مفتی سے فتویٰ لے۔ یہی بات آپ ﷺ نے وابصہؓ کو ارشاد فرمائی اور یہ بھی فرمایا کہ جو لوگ اگرچہ تمہیں کسی کام کا جائز اور حلال ہونے کا فتویٰ دیں لیکن اصل فتویٰ ضمیر کا ہے بس شرط یہ ہے کہ ضمیر زندہ ہو، صحیح وسلامت اور ایمان والا ہو۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ آدم علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا:

''تم کوئی کام کرنے کا ارادہ کرو تو پہلے تین باتیں پوری کرلو: اوّل وہ کام کرنے سے پہلے اپنے دل کی حالت دیکھو اور اگر یہ مطمئن نہیں ہے تو یہ کام نہ کرو کیونکہ میں جب منع کردہ درخت کی طرف گیا تو میرا دل بے چین ہو گیا۔ دوم اس کام کی عاقبت اور انجام کو دیکھو، میں اگر ممنوعہ درخت کے پھل کھانے کے انجام کو دیکھتا تو اسے ہرگز نہ کھاتا۔ سوم اس کام کے بارے میں اچھے اور نیک لوگوں سے مشورہ کرو، میں اگر فرشتوں سے مشورہ کرتا تو وہ لازماً اس کے نہ کھانے کا مشورہ دیتے۔''

آپ ﷺ کا یہ فرمانا ''گناہ وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹکے اور لوگوں کو اس کی اطلاع ہونا تمہیں اچھا نہ لگے'' اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ اسلام لوگوں میں اجتماعی شعور بیدار کرتا

ہے اور لوگوں کو نیکی اور بدی کا تصور ذہن نشین کراتا ہے تا کہ وہ لوگ اچھے کام کو اچھا کہیں، بُرے کو بُرا کہیں اور انہیں اچھائی اور نیکی کے کام سے خوشی واطمینان ہو اور مجموعی معاشرے کی طرف سے اچھائیوں کی ہمت افزائی اور پشت پناہی ہو۔ نیز بُرائی کرنے والوں کو شرم آئے اور لوگوں کی طرف سے لعن طعن اور گرفت کا خوف رہے۔

حدیث میں آمدہ لفظ ''الناس'' یعنی لوگوں سے مراد اچھے اور نیک لوگ ہیں جن میں نیکی و بدی کا شعور اور اللہ ورسول ﷺ پر ایمان ہو اور ایسے باوقار و سنجیدہ ہوں کہ ان کی سوچ صحیح ہو اور ان کی رائے کو وزن ہو۔ بُرے، مجرم، بے ضمیر اور ہلکے لوگ نہ ہوں۔ کسی نسلی، لسانی، گروہی، مسلکی اور قومی عصبیت اور شرک وکفر میں مبتلا نہ ہوں لیکن اگر یہ بُری صفات کے حامل ہیں تو پھر ان کی رائے کا کوئی وزن نہیں ہے۔

''اگر چہ (مفتی) لوگ تجھے اس کے جائز ہونے کا فتویٰ دیں۔'' اس سے ایسی باتیں اور کام مراد ہیں جن میں شک اور شبے کی وجہ سے ناجائز اور حرام ہونے کا فتویٰ نہ دیا جاسکے' جیسے تمہارے پاس کسی ایسے آدمی کے پاس سے ہدیہ اور تحفہ آئے جس کی اکثر کمائی حرام کی ہے۔ مفتی کی طرف سے ایسا ہدیہ قبول کرنے کے جواز کا فتویٰ ملے گا لیکن انسان کا ضمیر مطمئن نہیں ہوگا' لہٰذا مومن کا محتاط کردار یہ ہے کہ اس ہدیے کو قبول نہ کرے یا قبول کرے تو اسے استعمال میں نہ لائے اگر چہ مفتی کا فتویٰ جواز پر ہی ملا ہے۔

اس حدیث سے زندگی کے ہر معاملے اور کام میں رہنمائی لی جاسکتی ہے اور آدمی شریعت کے حکم پر عمل کرنے میں تاویلوں، بہانوں اور عذرات سے بچتے ہوئے پاکیزہ زندگی آسانی سے گزار سکتا ہے۔

حدیث نمبر 28

سنت پر قائم رہنا

عَنْ أَبِیْ نَجِیْحٍ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِیَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: ”وَعَظَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ مَوْعِظَةً وَجِلَتْ مِنْھَا الْقُلُوْبُ وَذَرَفَتْ مِنْھَا الْعُیُوْنُ، فَقُلْنَا: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کَاَنَّھَا مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ فَأَوْصِنَا، قَالَ: أُوْصِیْکُمْ بِتَقْوَی اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ، وَإِنْ تَاَمَّرَ عَلَیْکُمْ عَبْدٌ، فَاِنَّہٗ مَنْ یَعِشْ مِنْکُمْ فَسَیَرَی اِخْتِلَافًا کَثِیْرًا، فَعَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَھْدِیِّیْنَ عَضُّوا عَلَیْھَا بِالنَّوَاجِذِ، وَإِیَّاکُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ، فَاِنَّ کُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَکُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ، وَکُلَّ ضَلَالَةٍ فِی النَّارِ.“ (رواہ ابوداؤد والترمذی وقال حدیث حسن صحیح)

”حضرت ابی نجیح عرباض بن ساریہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا وعظ فرمایا کہ ہمارے دل کانپ اُٹھے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، ہم نے عرض کیا ”یارسول اللہ! ﷺ یہ تو ایسی نصیحت ہے جو رخصت ہوتے وقت کی جاتی ہے لہٰذا آپ ہمیں وصیت فرما دیجیے۔“ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا ”میں تم کو اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں اور (امیر کی بات) سننے اور اطاعت کرنے کی وصیت کرتا ہوں اگرچہ تمہارا امیر کوئی غلام ہی کیوں نہ ہو اور تم میں سے جو شخص میرے بعد زندہ رہے گا، وہ عنقریب بہت سے اختلافات دیکھے گا۔ تم کو چاہیے کہ میری سنت اور میرے خلفائے

راشدین کی سنت پر جمے رہو، یہ خلفاء اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ ہیں۔ میری اور میرے خلفاء کی سنتوں کو مضبوطی سے پکڑے رہنا اور تم کو چاہیے کہ نئی چیزوں سے بچتے رہو کیونکہ ہر نئی چیز بدعت ہے اور بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی آگ میں لے جانے والی ہے۔"

تشریح:

نبی ﷺ نے اپنے صحابہ کرامؓ کو دل نرم کرنے، آخرت کی یاد دلانے اور خوفِ خدا پیدا کرنے والا وعظ کیا تھا۔ چنانچہ ان میں یہ کیفیت پیدا ہوئی جو حدیث میں بیان ہوئی ہے پھر انہوں نے وصیت کرنے کا تقاضا کیا جس کے جواب میں آپ ﷺ نے یہ باتیں بیان فرمائیں:

(۱) تقویٰ

سب سے پہلے آپ ﷺ نے تقویٰ کی وصیت کی۔ حقیقت یہ ہے کہ تقویٰ اسلام اور ایمان کی وہ اہم بنیاد ہے جس سے مومن کی زندگی سدھر جاتی ہے اور وہ گناہوں سے محفوظ رہتا ہے۔ دین کے احکام کا حاصل اور ثمرہ تقویٰ ہے، مومن مین جب تقویٰ پیدا ہو جائے تو وہ خود بخود نیکی کی راہ پر چلتا رہتا ہے اور بُرائیوں سے دُور ہوتا جاتا ہے۔

(۲) امیر کی سمع وطاعت

دوسری وصیت آپ ﷺ نے امیر کی بات سننے اور اس کی فرماں برداری کرنے کی فرمائی۔ اسلام ایک جامع دین ہے جو انسانی زندگی کے انفرادی خواہ اجتماعی تمام معاملات کو اپنے دائرے میں سمیٹتا ہے لہٰذا اجتماعی زندگی کو منظم کرنے، اسلام کا نظام نافذ کرنے، اسے قائم رکھنے، دنیا میں اس کی اشاعت کرنے اور اس کی راہ میں آڑے آنے والی اور مزاحمت کرنے والی قوتوں کو دفع کرنے (جہاد کرنے) کے لیے اجتماعی سیاسی نظام قائم ہونا اور اس کا ایک امیر وسربراہ ہونا ضروری ہے۔ امیر اور اجتماعی سیاسی نظام کا ایک نقشہ ہمیں نبی اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین (چاروں خلفاء) کے دور میں ملتا ہے۔ یہ نقشہ ہی ماڈل اور مثالی نمونہ ہے جسے اجتماعی زندگی میں سامنے رکھنا ہے۔

اسلام کا اجتماعی نظام قائم نہ کیا جائے تو نہ صرف اسلام کے کتنے ہی احکام معطل (بے کار) ہو جاتے ہیں بلکہ اسلام دنیا میں نامکمل رہ جائے گا اور اس کے انفرادی احکام بھی پوری طرح ادا نہیں ہو سکیں گے۔ اسلام میں اجتماعیت کی اہمیت کا اندازہ اس آیتِ کریمہ سے لگایا جا سکتا ہے جو ذیل میں دی جا رہی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ. (النساء۴:۵۹)

''اے ایمان والو! فرماں برداری کرو اللہ کی، فرماں برداری کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں پھر اگر تمہارا کسی معاملے میں جھگڑا ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔''

نبی ﷺ نے فرمایا:

اِذَا كَانَ ثَلٰثَةٌ فِيْ سَفَرٍ فَلْيُؤَمِّرُوْا اَحَدَهُمْ. (ابوداؤد)

''جب تین آدمی کسی سفر میں ہوں تو وہ اپنے میں سے کسی ایک کو امیر بنائیں۔''

بخاری شریف میں حدیث ہے:

''امیر کی بات سنو اور فرماں برداری کرو اگرچہ تم پر ایسے آدمی کو امیر مقرر کیا جائے جو حبشی غلام ہو اور اس کا سر ایسا (چھوٹا) ہو جیسے منقی کا دانہ''

اسلام کے اجتماعی نظام میں امیر کی اطاعت اور تابع داری کرنا لازمی امر ہے، البتہ یہ تابع داری اللہ اور رسول کے احکام کے مطابق ہوگی۔ سو اگر وہ ایسا حکم دے جس میں اللہ اور رسول کے احکام کی واضح مخالفت ہو تو اس کی پیروی نہیں کی جائے گی، اس طرح ایک مرتبہ اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد اسے معمولی اختلاف اور مخالفت کی بناء پر ختم کرنا صحیح نہیں ہے۔ نبی کریم ﷺ کے فرمان کے مطابق ان میں جب بھی کھلم کھلا کفر دیکھنے میں آئے تو مخالفت کی جائے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک قائم حکومت کو جو اگرچہ شروع میں غلط نمونے پر قائم ہوئی ہے، اسلام اسے ختم کرنے کو پسند نہیں کرتا اس لیے آپ ﷺ نے حاکموں کی بات سننے اور اطاعت کرنے کا واضح حکم دیا ہے۔

(۳) آپ ﷺ کی پیشین گوئی:

آپ ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی کہ جو شخص میرے بعد زندہ رہے گا، وہ اُمت میں اختلاف دیکھے گا۔ اس ارشاد کے سیاق وسباق پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اختلاف سیاسی واجتماعی زندگی میں رونما ہوں گے اگرچہ اس پیشین گوئی کی ابتدا تو آپ ﷺ کی وفات کے بعد خلافت کے مسئلے، مانعین زکوٰۃ کے مسئلے اور جیش اسامہ کی روانگی کے معاملے میں ہوگئی تھی لیکن ان کو جلد ہی حل کرلیا گیا اور اختلافات ختم ہوگئے البتہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے دور میں یہ بڑھتے گئے جو چل رہے ہیں۔

نبی ﷺ نے ایسی حالت میں ایک کسوٹی اور معیار بتایا ہے اس معیار کو سامنے رکھا جائے تو آدمی گمراہی اور بے راہ روی سے بچ جائے گا وہ معیار ہے سنتِ رسول اور سنتِ خلفائے راشدین کی اخلاص وایمان داری سے پیروی کرنا اور اس سنت کو مضبوطی سے چمٹ جانا۔ مضبوطی سے چمٹنے کو سمجھاتے ہوئے فرمایا کہ جیسے آدمی کوئی سخت گرہ کو جو ہاتھوں سے نہ کھلے تو دانتوں سے پکڑ کر کھولتا ہے ایسے ہی اپنے مسائل سنت سے حل کریں اور کسی اور طرف نہ دیکھیں۔ رسول اللہ ﷺ کی سنت اور خلفائے راشدین کی سنت ہمارے سامنے یہ حدیث وسیرت کی مشہور کتابوں اور نیک وصالح لوگوں کے اعمال کی صورت میں موجود ہے۔ آپ ﷺ نے اپنے ایک ارشاد میں فرمایا:

لَا یَزَالُ مِنْ اُمَّتِیْ اُمَّۃٌ قَائِمَۃً بِاَمْرِ اللّٰہِ لَا یَضُرُّھُمْ مَنْ خَذَلَھُمْ وَلَا مَنْ خَالَفَھُمْ حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُ اللّٰہِ وَھُمْ عَلٰی ذٰلِکَ. (مشکوٰۃ شریف)

''ہمیشہ میری اُمت کا ایک گروہ اللہ کے امر (اس کے دین) پر قائم رہے گا جو شخص انہیں کمزور کرے اور جو ان کی مخالفت کرے تو انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا حتیٰ کہ وہ گروہ اللہ کے حکم (موت) آنے تک اس حالت پر قائم رہے گا۔''

(۴) بدعت سے بچنا:

دین میں نئی بات نکالنے اور گھڑنے کو بدعت کہا جاتا ہے، بدعت کی مختصر حقیقت یہ

ہے کہ اس کی بڑی دو قسمیں ہیں: ایک ایسی بات جس کی دین میں کوئی اصل نہیں ہے جیسے قبروں پر چادریں چڑھانا، ان پر چراغ جلانا یا قبروں کو پکا کرنا یا خاص موقعوں پر خاص طعام تیار کرنا جیسے رجب میں کونڈے، ۱۰ محرم کو سبیلیں لگانا، کھچڑا پکانا اور انہیں دین سمجھ کر کرنا یہ کام بدعت کے ہیں۔

دوسری صورت یہ کہ ایسے عمل جن کی دین میں اصل اور بنیاد ہے جیسے رمضان المبارک کی راتوں کو تراویح پڑھنا اور دیگر نوافل پڑھنا یعنی اصولی طور پر نوافل کا سنت ہونے کے لیے ثبوت ہے اب تعداد کی کمی بیشی میں اختلاف کو کسی صورت کو بدعت کہنا صحیح نہیں ہے بلکہ آٹھ، بارہ، بیس اور چالیس کی گنجائش ہے اور یہ صورتیں سنت کے قریب ہیں لہٰذا انہیں بدعت کہنا اور ہر بدعت گمراہی کہنا، باہمی جھگڑے کرنا، مناظرے کرنا، پوسٹر چھاپنا اور ایک دوسرے پر سخت تنقیدیں کرنا درست نہیں بلکہ یہ اسلام کی روح کے خلاف ہے۔

سنت اور بدعت کا لفظ کبھی لفظی اور لغوی معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی اصطلاحی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ بدعت پر اس کتاب کی حدیث نمبر ۵ ملاحظہ کریں اور بدعت کی مزید تفصیل اور حقیقت اسی موضوع پر لکھی ہوئی کتابوں میں موجود ہے، وہ پڑھنی چاہئیں۔

حدیث نمبر 29

دین کا مکمل نقشہ

عَنْ مَعَاذ بْنِ جَبَلٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: قُلْتَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ أَخْبِرْنِی بِعَمَلٍ یُدْخِلُنِی الْجَنَّۃَ وَیُبَاعِدُنِی عَنِ النَّارِ؟ قَالَ: لَقَدْ سَأَلْتَ عَنْ عَظِیْمٍ وَاِنَّہٗ لَیَسِیْرٌ" عَلٰی مَنْ یَسَّرَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ، تَعْبُدُ اللّٰہَ لاَ تُشْرِکُ بِہٖ شَیْئًا وَتُقِیْمُ الصَّلاَۃَ وَتُؤْتِي الزَّکَاۃَ، وَتَصُوْمُ رَمَضَانَ، وَتَحُجُّ الْبَیْتَ، ثُمَّ قَالَ: أَلا أَدُلُّکَ عَلَی أَبْوَابِ الْخَیْرِ؟ اَلصَّوْمُ جُنَّۃٌ، وَالصَّدَقَۃُ تُطْفِیءُ الْخَطِیْئَۃَ کَمَا یُطْفِیءُ الْمَاءُ النَّارَ، وَصَلاَۃُ الرَّجُلِ فِی جَوْفِ اللَّیْلِ، ثُمَّ تَلا:
تَتَجَافٰی جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ حَتّٰی بَلَغَ، یَعْمَلُوْنَ، ثُمَّ قَالَ، أَلا أُخْبِرُکَ بِرَأْسِ الْأَمْرِ وَعَمُوْدِہٖ وَذِرْوَۃِ سَنَامِہٖ؟ قُلْتُ: بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ: رَأْسَ الْأَمْرِ الاِسْلاَمُ وَعَمُوْدُہُ الصَّلاَۃُ، وَذِرْوَۃُ سَنَامِہٖ الْجِھَادُ، ثُمَّ قَالَ: أَلاَ أُخْبِرُکَ بِمِلاَکَ ذٰلِکَ کُلِّہٖ؟ قُلْتُ: بَلٰی یَارَسُوْلَ اللّٰہِ، فَأَخَذَ بِلِسَانِہٖ، وَقَالَ: کُفَّ عَلَیْکَ ھٰذَا، قُلْتُ یَا نَبِیَّ اللّٰہِ وَاِنَّا لَمُؤَاخَذُوْنَ بِمَا نَتَکَلَّمُ بِہٖ فَقَالَ ثَکِلَتْکَ أُمُّکَ یَا معاذُ وَھَلْ یَکُبُّ النَّاسَ النَّارَ عَلٰی وُجُوْھِھِمْ أَوْ قَالَ: عَلَی مَنَاخِرِھِم إِلَّا حَصَائِدُ أَلْسِنَتِھِمْ. (رواہ الترمذی وقال: حدیث حسن صحیح)

''حضرت معاذ بن جبل روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ ''یارسول اللہ! ﷺ ایسا عمل بتا دیجیے جو مجھے جنت میں داخل کر

دے اور دوزخ سے دُور کردے۔'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''تم نے بڑی عظیم چیز کے بارے میں سوال کیا ہے اور بلاشبہ یہ اس شخص کے لیے آسان بھی ہے جس کے لیے اللہ آسانی پیدا فرما دے۔'' پھر ارشاد فرمایا ''تم اللہ کی اس طرح عبادت کرو کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو اور بیت اللہ کا حج کرو۔'' اس کے بعد فرمایا ''کیا میں تم کو خیر کے دروازے نہ بتا دوں؟ سنو! خیر کے دروازے یہ ہیں: روزہ ڈھال ہے اور صدقہ گناہ کو اس طرح بجھا دیتا ہے جیسے پانی آگ کو بجھاتا ہے اور انسان کا رات کے درمیانی حصہ میں نماز پڑھنا'' اس کے بعد یہ آیت تلاوت فرمائی:

تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ○ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ. (السجدہ ۳۲:۱۶، ۱۷)

''ان کے پہلو خواب گاہ سے علیحدہ ہوتے ہیں، وہ اپنے رب کو خوف اور امید کے ساتھ پکارتے ہیں اور ہماری دی ہوئی چیزوں میں سے خرچ کرتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ پوشیدہ طور پر ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے کیا رکھا گیا ہے۔ یہ بدلہ ہے اس کا جو کرتے تھے۔''

پھر فرمایا ''کیا تم کو دین کی اصل چیز، اس کا ستون اور اس کی چوٹی کا عمل نہ بتا دوں؟'' میں نے عرض کیا ''یا رسول اللہ! ﷺ ارشاد فرمائیں'' آپ ﷺ نے فرمایا ''دین کی اصل چیز اسلام ہے (یعنی حکم سُن کر فرماں برداری کے لیے آمادہ ہو جانا) اور دین کا ستون نماز ہے اور اس کی چوٹی کا عمل جہاد ہے'' پھر فرمایا ''کیا تم کو ایسا عمل نہ بتا دوں جس کے ذریعے ان سب اعمال پر قابو پایا جا سکے؟'' میں نے عرض کیا ''ضرور یا رسول اللہ! ﷺ'' اس پر آپ ﷺ نے اپنی زبان مبارک پکڑ کر فرمایا ''اس کو اپنے حق میں مصیبت بننے سے روکو۔'' میں نے عرض کیا ''اللہ کے نبی ﷺ کیا ہمارے بولنے پر بھی ہماری گرفت

ہوگی؟'' معاذؓ! تم بھی عجیب آدمی ہو، لوگوں کو منہ کے بل یا آپؐ نے فرمایا ناک کے بل آگ میں دھکیلنے والی ان کی زبان کی کھیتی کے علاوہ اور کیا چیز ہے؟''

تشریح:

یہ حدیث ان جامع احادیث میں سے ایک ہے جن میں اسلام کی بنیادی تعلیم دی گئی ہے اور دینِ اسلام کا پورا نقشہ کھینچا گیا ہے جس پر چلنے اور عمل کرنے سے آدمی کامل مومن بن جاتا ہے اور دوزخ سے بچ کر جنت کا حق دار ہو جاتا ہے۔

حدیث کی ابتدا میں حضرت معاذؓ کی تمنا اور خواہش یہ ظاہر کرتی ہے کہ صحابہ کرامؓ کو ہر وقت یہی فکر لاحق رہتی تھی کہ کسی طرح دوزخ کے عذاب سے بچ جائیں اور اللہ کی نعمتوں یعنی جنت کے حق دار بن جائیں۔ حضرات صحابہؓ کی زندگی کے حالات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً ہر ایک صحابی نے مختلف مواقع پر ایسی تمنا ظاہر کی ہے۔ درحقیقت ہر مومن کا بھی یہی رویہ ہونا چاہیے کہ ہر دَم اپنی آخرت سدھارنے کی فکر کرتا رہے اس مقصد کے لیے اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے احکام معلوم کرے اور ان پر عمل پیرا رہے۔

نبی اکرم ﷺ نے معاذؓ کو بہشت میں داخلے کے لیے جو نصیحتیں کی ہیں، ان میں دین کی تقریباً تمام بنیادی باتیں آ جاتی ہیں یعنی عقائد، عبادات، نوافل اور جہاد وغیرہ۔ ان اعمال میں اسلام کی اجتماعی زندگی کا پورا نظام شامل ہے۔ نیز کبیرہ گناہوں سے کنارہ کشی کرنے کا تذکرہ اور زبان کا کردار واضح کر کے بیان فرما دیا۔

نبی اکرم ﷺ نے حضرت معاذؓ کو بتایا کہ جنت حاصل کرنا اتنا آسان نہیں ہے بلکہ اس کے لیے زندگی بھر مسلسل عمل کرنے اور بُرائیوں سے بچنے کی ضرورت ہے۔ عمل بھی صرف فرائض نہیں بلکہ ان کے ساتھ نوافل بھی ادا کرنے ہیں جو کافی مشکل عمل ہے پھر آپ ﷺ نے اپنی بات کی تائید میں جو آیت تلاوت فرمائی اس میں بھی کچھ ایسے ہی اعمال بتائے گئے ہیں اور آیت کے آخر میں کہا گیا ہے:

جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ.

''یعنی یہ بہشت جزا اور بدلہ ہے ان اعمال کا جو یہ دنیا کی زندگی میں کرتے

رہے ہیں۔''

حدیث زیر مطالعہ کی تفصیلی تشریح ان مختصر صفحات میں کرنا مشکل ہے تاہم اس کے بعض ضروری نکات کی تھوڑی سی تفسیر عرض کی جاتی ہے۔

نبی ﷺ نے اسلام کے بنیادی ارکان میں سب سے پہلے جس بات کا تذکرہ فرمایا یہ کہ اللہ کی عبادت کرو، اس میں کسی کو شریک نہ کرو یعنی تمہاری عبادت خالص اللہ کے لیے ہو اور اس میں کسی اور کا حصہ نہ ہو جو بھی نیکی کا کام کیا جائے، وہ اللہ کے لیے خالص ہو، کسی دوسرے کو خوش کرنے یا کسی کا خوف کھانے کی وجہ سے یا کسی میں امید اور لالچ کی بناء پر نہ ہو اس کیفیت کا دوسرا نام اخلاص ہے۔

فرض عبادات کے بعد نفلی عبادات کا بیان ہے، ان میں نفلی روزوں، رات کو نوافل پڑھنے اور نفلی صدقات کرنے کے درجات وفضائل کا تذکرہ ہے۔ درحقیقت نفلی عبادات فرائض کی زیب وزینت اور ان کی تکمیل ہیں۔ نیز ان میں جو کوتاہیاں رہ جاتی ہیں، ان کی تلافی ہے پھر نفلی عبادتوں میں کوتاہی ہوگی تو ان کا اثر فرائض پر واقع ہوگا جو آگے چل کر فرائض کے ترک پر منتج ہوگا لہٰذا نفلی عبادات کی پابندی کرنے کی ہر وقت کوشش ہونی چاہیے۔

اس کے بعد نبی اکرم ﷺ نے انسانی زندگی میں دین کی ضرورت واہمیت اور دین میں نماز وجہاد کی اہمیت مثال دے کر واضح کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''انسان کے لیے دین واخلاق کا سرا اسلام ہے'' یعنی نبی ﷺ کی نبوت کے بعد اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین قبول نہیں ہے بس دین اسلام ہی اللہ کے ہاں قبول ہے۔ دینِ اسلام کی حیثیت واہمیت ایسے ہے جیسے حیوان کے لیے سر کی حیثیت ہوتی ہے، کسی حیوان کا سر کاٹ دیا جائے تو وہ حیوان ختم ہو جائے گا' اسی طرح دینِ اسلام کے بغیر انسان بھی صحیح انسانی حیثیت سے محروم ہو جائے گا۔

پھر دین میں نماز کی حیثیت ایسے ہے جیسے مکان میں ستون کی ہوتی ہے اگر مکان میں سے ستون نکال دیا جائے تو مکان گر جائے گا اسی طرح اسلام بھی نماز کے سوا قائم نہیں رہ سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن وحدیث میں نماز ادا کرنے کی اتنی سخت تاکید آئی اور اسے

چھوڑنے پر سخت وعید آئی ہے۔

دینِ اسلام کی چوٹی یا بالائی حصہ جہاد کو کہا گیا ہے۔ اسلام میں جہاد کی بہت زیادہ اہمیت ہے اس قدر کہ بعض علماء نے اسے فرض عبادات میں شامل کیا ہے اور ارکانِ اسلام یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے بعد جہاد کو بیان کیا گیا ہے۔

چونکہ اُمتِ محمدیہؐ اُمتِ دعوت ہے، یہ اُمت اُٹھائی ہی اس لیے گئی ہے کہ دنیا میں نیکی پھیلائے اور بُرائی مٹائے۔ اس مقصد کے لیے جو کوشش جس طریقے سے بھی کی جائے، اسے جہاد کہا جاتا ہے۔ اسلامی اصطلاحات میں جتنے وسیع معنی جہاد کا کلمہ رکھتا ہے شاید ہی کوئی دوسرا لفظ رکھتا ہو اس لیے جہاد کا دائرہ بہت ہی وسیع ہے۔ زبان سے حق کا کلمہ کہنے سے لے کر جان قربان کر دینے تک جدوجہد کا تمام سلسلہ جہاد ہے' البتہ جہاد کا بالائی درجہ قتال یعنی اللہ کی رضا کے لیے اللہ کے دین کو قوت کے ذریعے پھیلانا اور اس کی راہ میں پیش آنے والی طاقتوں کو ختم کرنا جہاد کا بلند ترین درجہ ہے۔ اسے قرآن مجید اور احادیث میں قتال بھی کہا گیا ہے۔ یہ عمل اتنا اعلیٰ اور افضل ہے کہ اس کے برابر دوسرا عمل نہیں ہو سکتا اس کا اندازہ اس حدیث سے کریں:

حضرت ابوہریرہؓ نے روایت کرتے ہوئے کہا کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور عرض کیا ''یارسول اللہ! ﷺ مجھے ایسا عمل بتائیے جو جہاد کے برابر ہو'' آپ ﷺ نے فرمایا ''میں کوئی ایسا عمل نہیں پاتا'' پھر آپ ﷺ نے فرمایا ''کیا تیرے اندر اتنی طاقت ہے کہ جب مجاہد (جہاد کے لیے) نکلے تو تم اپنی مسجد میں داخل ہو جاؤ اور مسلسل نماز میں کھڑے رہو اور درمیان میں وقفہ نہ کرو اور پیہم روزے رکھو اور افطار نہ کرو؟'' اس شخص نے جواب دیا ''اتنی طاقت کس میں ہے؟''

مطلب یہ کہ کامل مومن بننے اور جنت کا حق دار ہونے کے لیے جہاد کی ضرورت ہے لہٰذا مومن کو چاہیے کہ جہاد کے کاموں میں سے کوئی نہ کوئی کام کرتا رہے۔ پھر جہاد کی جو ضروری شرائط ہیں ان کی تکمیل کے لیے بھی کوشش کرے' تاکہ وہ مقبول ہو' اس کے اثرات دنیا میں ظاہر ہوں اور اتنی بڑی محنت ضائع نہ جائے۔

نبی ﷺ نے اپنے پیارے صحابی کو جو آخری اہم بات بتائی وہ زبان اپنے قابو میں

رکھنا اور اسے آزاد نہ چھوڑنا ہے۔ زبان کا کردار بہت وسیع' بڑا اہم اور نازک ہے۔ درحقیقت اکثر نیکیاں زبان سے ادا ہوتی ہیں' اسی طرح گناہوں کے بڑے حصے کا تعلق بھی زبان سے ہے' چاہے گناہ کبیرہ ہوں یا صغیرہ' اکثر کا تعلق زبان سے ہے۔

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

مَنْ يَضْمَنْ لِيْ مَا بَيْنَ لَحْيَيْهِ وَمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ اَضْمَنْ لَهُ الْجَنَّةَ ( )

''جو شخص مجھے دو چیزوں (کے صحیح استعمال) کی ضمانت دے ایک وہ جو اس کے دونوں جبڑوں کے درمیان ہے اور دوسری وہ چیز جو اس کی رانوں کے درمیان ہے تو میں اس کے لیے جنت (میں داخل ہونے) کی ضمانت دیتا ہوں''۔

مومن کو چاہیے کہ اپنی زبان اچھی طرح قابو میں رکھے اور اس پر پورا قابو کرے تو بہت سی برائیوں سے بچ جائے گا اور اس کے صحیح استعمال پر بڑی نیکیوں کا حق دار بنے گا۔

حدیث نمبر 30

دین میں اعتدال

عَنْ أَبِي ثَعْلَبَةَ الْخُشَنِيِّ جُرْثُومِ بْنِ نَاشِرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ قَالَ: إِنَّ اللهَ تَعَالَى فَرَضَ فَرَائِضَ فَلَا تُضَيِّعُوهَا، وَحَدَّ حُدُودًا فَلَا تَعْتَدُوهَا، وَحَرَّمَ أَشْيَاءَ فَلَا تَنْتَهِكُوهَا وَسَكَتَ عَنْ أَشْيَاءَ رَحْمَةً لَكُمْ غَيْرَ نِسْيَانٍ فَلَا تَبْحَثُوا عَنْهَا" حَدِيثٌ حَسَنٌ رَوَاهُ الدَّارَ قُطْنِيُّ وَغَيْرُهُ

ابوثعلبہ خشنی جرثوم بن ناشرؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے کچھ باتیں فرض کی ہیں سوانہیں ضائع نہ کرو، کچھ حدیں مقرر کی ہیں پس انہیں نہ پھلانگو، بعض چیزیں حرام قرار دی ہیں اور بہت سی چیزوں سے تم پر رحمت کرتے ہوئے بغیر بھولے خاموشی اختیار کی ہے سواُن کی کرید نہ کرو۔

تشریح

اس حدیث مبارک میں نبی کریم ﷺ نے جن چار باتوں کا حکم دیا ہے وہ بنیادی اور بہت اہم ہیں۔ اوّل فرائض کی پابندی کرنا، دوئم کچھ حدود مقرر کی ہیں سو اُنہیں نہ پھلانگنا، سوئم اللہ کی حرام کردہ باتوں سے بچنا اور چہارم جن اشیاء اور باتوں کے بارے میں بغیر کسی بھول کے تم پر رحم کرتے ہوئے خاموشی اختیار کی ہے ان کے بارے میں نہ کریدنا ان کا مختصر سا بیان کیا جاتا ہے۔

(۱) فرائض: اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی بھلائی بہتری اور دونوں جہانوں کی کامیابی کے لئے کچھ اعمال کی ادائیگی لازم کردی ہے۔ یہ فرائض کہلاتے ہیں انہیں ادا کرنا لازم

فرض ہے۔ مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی نے اپنی کتاب ''فرائض اسلام'' میں فرضوں کے بارے میں لکھا ہے کہ ہر فرض سے تین باتیں تعلق رکھتی ہیں جن کی تکمیل ضروری ہے:

اوّل ہر مومن پر لازم (فرض) ہے کہ شریعت کے فرائض کا علم حاصل کرے کہ مومن ہونے کی حیثیت سے مجھ پر کون سی باتیں فرض ہیں۔ علماء کہتے ہیں کہ فرائض کا علم حاصل کرنا مسلمانوں پر فرض ہے جیسے انسان بالغ ہو جائے اس پر نماز فرض ہو تو اس کے لازمی ارکان کا معلوم کرنا فرض ہے' اسی طرح رمضان کی آمد پر روزوں کا علم حاصل کرنا اور زکوٰۃ کا علم حاصل کرنا فرض ہے۔

دوم فرائض کے لازمی ہونے پر اعتقاد ویقین رکھے اور سوئم یہ کہ انہیں ادا کرے۔ مخدوم صاحب نے اپنی کتاب میں سینکڑوں فرائض شمار کیے ہیں جو مسلمان کی انفرادی واجتماعی زندگی کے مختصر گوشوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

آج ہمارے مسلم معاشرے میں جزئیات، مستحبات، فروعات/مباحات اور مکروہات پر بڑی بحثیں ہوتی ہیں، مناظرے ہوتے ہیں، پوسٹر، مضمون، کتابچے اور کتابیں چھپتی ہیں۔ ایک دوسرے سے ان فروعات پر شدت کی وجہ سے نفرت اور بیر پیدا ہوتے ہیں اور مسلمان گروہوں، ٹولوں اور مسلکوں اور فرقوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو گمراہ، فاسق، مشرک وکافر تک کہتے ہیں لیکن فرائض اور واجبات کے بارے اتنی محنت اور جدوجہد نہیں کی جاتی جبکہ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ زندگی سے تعلق رکھنے والے فرائض کو معلوم کرے، ان پر پختہ اعتقاد رکھے اور انہیں ادا کرے۔

اسی طرح فرائض، واجبات، سنن، مستحبات اور نوافل کی ادائیگی میں توازن اور اعتدال اختیار کیا جائے اور ہر عمل کو اس کے درجے پر رکھا جائے، فرائض ہر حالت میں ادا کیے جائیں اور دوسرے احکام بھی درجہ بہ درجہ ادا کیے جائیں۔ ایسا انداز نہیں ہونا چاہیے کہ فرائض تو چھوڑ دیئے جائیں اور نوافل اور مستحبات پر زور دیا جائے۔ نبی ﷺ نے یہی بات ارشاد فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے جو فرائض مقرر کیے ہیں، انہیں ہر حالت میں ادا کرتے رہو اور ضائع نہ کرو۔

(۲) کتنی ہی حدیں مقرر کی ہیں۔

حدود کی پابندی:

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ارشاد فرمایا:

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ. (المائدہ ۵:۸۷)

''اے ایمان والو! جو پاک چیزیں اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں، انہیں حرام نہ کرلو اور حد سے تجاوز نہ کرو، اللہ کو زیادتی کرنے والے سخت ناپسند ہیں۔''

''حدیں پھلانگنے (عبور کرنے) کی کئی صورتیں ہیں جن میں اصولی بات یہ ہے کہ اعتدال کوملحوظ نہ رکھا جائے اور افراط وتفریط اختیار کیا جائے، اللہ اور رسول کی مقرر کردہ حدود کالحاظ نہ کرنے، انہیں توڑنے اور ان میں کمی وبیشی کی کئی صورتیں ہیں۔

(الف) جیسے ذیقعدہ، محرم اور صفر کے مہینوں میں شادی کرنے کوحرام سمجھنا۔بعض لوگوں کے ہاں عورت کا دوسرا نکاح کرنا حرام ہونا۔

(ب) کسی ایسے کام کو دین کا کام اور ثواب سمجھ کر کرنا جو شریعت میں نہیں ہے جیسے شب برأت کا حلوہ، عید کی سویاں اور گیارہویں کا دودھ وغیرہ۔

(ج) اس طرح کی مطلق (عام) مباح ومستحب یا سنت کے عمل کو وقت کے ساتھ مقید (مقرر کرنا) جیسے فجر اور عصر کی نماز کے بعد لازماً مصافحہ کرنا، عید کے بعد معانقہ کرنا، ایصالِ ثواب کے کھانے کے لیے دن مقرر کرنا جیسے تیجا، دسواں، بارہواں، چالیسواں اور جمعرات وغیرہ۔

(د) حدود پار کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ کسی عمل کی ایسی فضیلت اور ایسا ثواب گھڑ لینا جو قرآن اور حدیث سے ثابت نہیں ہے جیسے دعائے گنج العرش، عہدنامہ، نورنامہ اور درود لکھی کے فضائل وفوائد اور ثواب مقرر کیا ہوا ہے۔

(ھ) کسی عمل کی کوئی خاص ترکیب وترتیب اور انداز اپنی طرف سے مقرر کر لینا جو کہ حدیث میں ثابت نہ ہو جیسے نوافل نمازوں میں خاص سورتیں اور ان کی تعداد متعین مقرر کی جاتی ہے یا خاص دنوں میں اور مہینوں کی فضیلتیں اور ثواب کی مقدار مقرر کی گئی ہے۔

(و) ایک صورت یہ ہے کہ کسی جگہ یا وقت نیکی کرنے کو ضروری سمجھنا جیسے قبروں پر جا کر خیرات کرنا اور قرآن پڑھنا جبکہ ثواب تو ہر جگہ سے پہنچ سکتا ہے' اس طرح اپنی طرف سے کوئی طعام بعض لوگوں کے لیے ناجائز سمجھنا جیسے عقیقے کا گوشت یا کھانا، نانا، نانی کے لیے ناجائز سمجھنا۔

(ز) کسی عمل پر خاص عذاب اپنی طرف سے مقرر کر لینا جیسے سندھ میں مشہور ہے کہ بیٹی بالغ ہونے کے بعد ماں باپ کا کھانا حرام ہوتا ہے یا وہ گناہ گار ہوتے ہیں۔

الغرض ایسی بے شمار باتیں ہیں جو لوگوں نے اپنی طرف سے دین میں بڑھا لی ہیں، اسے بدعت بھی کہا جاتا ہے اور حدود سے آگے بڑھنا بھی کہا جاتا ہے۔ اس بارے میں مومن کا رویہ یہ ہونا چاہیے کہ قرآن مجید اور صحیح حدیث میں جو کچھ ہے اور جس طرح ہے اس سے آگے نہ بڑھا جائے۔

(۳) محرمات سے پرہیز:

حرام کی ہوئی باتوں سے بچنا، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے حرام کردہ چیزوں سے کوشش کر کے دُور رہے اس مقصد کے لیے سب سے پہلے حرام کردہ چیزوں کا علم حاصل کرنا، اس پر اعتقاد رکھنا اور ان سے بچنا اور دُور رہنا، آج ہمارے معاشرے میں اس بارے میں بھی کوتاہی ہے جیسے کچھ لوگ حقہ پینے اور تمباکو نوشی سے نفرت کرتے ہیں جبکہ دوسری طرف سود، رشوت اور حرام کمانے اور کھانے میں کوئی عیب نہیں سمجھتے اور انہیں بُرائی نہیں سمجھتے۔

(۴) مطلق کا لحاظ کرنا:

مسائل میں بحث نہ کرنے، گہرائی میں جانے اور ان کے بارے میں سوال نہ کرنے کا حکم نبی ﷺ کے زمانے میں تھا کیونکہ اس وقت شریعت نازل ہو رہی تھی اس لیے جتنے سوال کیے جاتے، اتنا حکم نازل ہو جاتا اور لوگوں کے لیے ان پر عمل کرنا مشکل ہوتا جیسے حج کا حکم آنے پر ایک شخص نے سوال کیا ''یارسول اللہ! ﷺ کیا ہر سال حج فرض ہے؟'' اس پر آپ ﷺ نے کچھ نہیں فرمایا اور خاموش رہے جب سائل نے یہ سوال تین مرتبہ کیا تو آپ

ﷺ نے فرمایا ''میں اگر ہاں کہہ دیتا تو ہر سال حج فرض ہو جاتا پھر تم تکلیف میں مبتلا ہو جاتے۔''

اس لیے عام لوگوں کو چاہیے کہ جس بات کو شریعت میں مطلق (عمومیت پر) چھوڑا گیا ہے اس کی تحقیق اور تدقیق اور باریک بینیوں میں نہیں جانا چاہیے۔ علماء نے کہا ہے کہ جب تک کوئی معاملہ عملاً واقع نہ ہو تب تک اس کے بارے میں سوال نہیں کرنا چاہیے۔ سلفؒ کہتے تھے دَعُوْهَا تَنَزَّلُ اسے اس وقت تک چھوڑ دو جب تک عملاً واقع نہ ہو جائے۔

کسی چیز کے بارے میں شریعت کا حکم نہ کرنے پر علماء کی مختلف آرا ہیں اور ان میں تین قول ہیں: ایک حظر (ممانعت) کا ہے یعنی وہ عمل نہیں کیا جائے گا، دوسرا اباحہ (جائز ہونے) کا ہے یعنی اسے استعمال کیا جائے گا کیونکہ جب شارعؑ نے اسے بیان نہ کیا تو گویا اس کے استعمال کی اجازت دے دی اور تیسرا توقف کا ہے یعنی جب تک حکم معلوم نہ ہو اس وقت تک عمل نہیں کیا جائے گا۔ ان کے تفصیلی احکام کتب فقہ و اصولِ فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں، وہاں دیکھے جائیں یا علماء سے معلوم کیے جائیں۔

حدیث نمبر 31

اللہ تعالیٰ کی رضا اور لوگوں کی محبت

عَنْ أَبِی الْعَبَّاسِ سَهْلِ بْنِ سَعْدِ السَّاعِدِیِّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَی النَّبِیِّ ﷺ، فَقَالَ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ دُلَّنِی عَلٰی عَمَلٍ إِذَا عَمِلْتُهُ أَحَبَّنِیَ اللّٰهُ وَأَحَبَّنِی النَّاسُ فَقَالَ: إِزْهَدْ فِی الدُّنْيَا يُحِبَّكَ اللّٰهُ وَازْهَدْ فِيْمَا عِنْدَ النَّاسِ يُحِبُّكَ النَّاسُ" حَدِيْثٌ حَسَنٌ، رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَغَيْرُهُ بِأَسَانِيْدَ حَسَنَةٍ.

''حضرت سہل بن سعد ساعدیؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا ''یارسول اللہ! ﷺ مجھے ایسا عمل بتا دیجیے جس کے کرنے سے اللہ تعالیٰ مجھ سے محبت کریں اور لوگ بھی مجھ سے محبت کرنے لگیں۔'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''دُنیا سے بے رُخی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے توجہ ہٹا لو تو لوگ تم سے محبت کرنے لگیں گے۔''

تشریح:

عام طور پر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ لوگ مجھ سے محبت کریں، عزت کی نگاہ سے دیکھیں، اچھے تعلقات قائم کریں، حسد ونفرت نہ کریں اور بدخواہی اور بُرائی کا برتاؤ نہ کریں پھر مومن کی سب سے بڑی خواہش وتمنا یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ پر مہربان ہو جائے، وہ مجھ سے محبت کرے اور اس کی ناراضی سے بچا رہوں اس حدیث شریف میں ان دونوں خواہشوں کی تکمیل کا راز بتایا گیا ہے۔

حدیث کے عربی متن میں یہ الفاظ آئے ہیں؟

اِزْهَدْ فِی الدُّنْیَا.

''تم دنیا کی طرف میلان نہ رکھو اور اس سے بے رغبتی برتو''

کلمہ زہد کے یہی معنی ہیں اور اس کے اصطلاحی معنی ہیں ''دنیا کی جن حلال اور جائز چیزوں کی انسان کو ضرورت نہیں ہے، انہیں چھوڑنا اور ضروریاتِ زندگی پر کفایت کرنا۔''

اس حدیث مبارکہ میں نبی کریم ﷺ نے زندگی سے تعلق رکھنے والی دو بنیادی باتیں بیان کی ہیں: ایک یہ کہ انسان کا دنیا سے اور اس کے ساز و سامان سے تعلق اور واسطہ کس قدر ہو؟ نیز مومن کا مال و متاع سے رویہ کیسا ہو؟

دوسری یہ کہ انسان اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور لوگوں کے ہاں پسندیدہ اور پیارا کیسے ہو سکتا ہے؟ کیسی صفت اختیار کرنے سے لوگوں میں ہر دل عزیز ہو سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کر سکتا ہے؟ یہ دونوں باتیں سمجھنے کے لیے دنیا کے متعلق ہم چند مختصر نکتے پیش کرتے ہیں، چونکہ دنیا اور اس کے ساز و سامان سے مومن کے تعلقات کے بہت سے درجے ہیں اس لیے اہلِ علم میں سے ہر شخص نے اپنی سمجھ، علم، ذوق تعبیر اور تاویل کے مطابق ان کی تشریح کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ان تعلقات کو سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے لہٰذا کوشش کر کے یہاں ان تعلقات کے مختلف پہلو خلاصے کے طور پر دیئے جاتے ہیں۔

(الف) انسان کے لیے اپنی ذات، اپنے اہل و عیال کی ضرورتوں کو پورا کرنے اور اہلِ قرابت کے حقوق ادا کرنے کی خاطر مال کمانا اور جمع کرنا نہ صرف جائز بلکہ واجب ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

لَا تَنْسَ نَصِیْبَکَ مِنَ الدُّنْیَا...... (القصص ۲۸:۷۷)

''دنیا سے اپنا حصہ حاصل کرنا نہ بھولو۔''

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ.

(البقرہ ۲:۲۰۱)

''ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی بھلائی

عطا کر اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔''

دنیا کی بھلائی سے مراد مادی، اخلاقی اور روحانی، تمدنی وتہذیبی ہر قسم کی بھلائی مراد ہے جب بھلائی کی طلب کر رہا ہے تو اسے کمانے کی کوشش بھی کرے۔

(ب) حلال روزی اور جائز سہولتیں حاصل کرنے کے لیے بھاگ دوڑ کرنا عبادت ہے اس سے انسان برکت وثواب کا مستحق ہوتا ہے اور اللہ اور اس کے رسولؐ کا پسندیدہ بندہ بنتا ہے۔ روزی کمانے میں سستی کرنا اور رزق کے لیے جدوجہد نہ کرنا اسلام میں ناپسندیدہ ہے۔ پاکستانی کرنسی نوٹ پر لکھا ہوا یہ جملہ ''حصولِ رزق حلال عبادت ہے'' بالکل صحیح اور شریعت کے مطابق ہے جن لوگوں نے یہ جملہ سوچا اور تحریر کرایا ہے، انہیں آفرین ہے۔

(ج) یہ دنیا مومن کے لیے عارضی مقام اور گزرگاہ ہے۔ نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ'' أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ. (ریاض الصالحین)

''تم دنیا میں اس طرح رہو کہ جیسے مسافر ہو یا راہ گزر ہو۔''

(د) یہ دنیا دارالعمل (عمل کرنے کی جگہ) ہے، یہاں پر کیے ہوئے اعمال کی جزا یا سزا آخرت میں ملے گی، دنیا کی حقیقت بتاتے ہوئے ایک بزرگ نے فرمایا:

''دنیا میں جو انسان ہیں وہ گویا مہمان ہیں اور جو کچھ ان کے ہاتھوں میں ہے، وہ عاریتاً مانگ کر لیا ہوا سامان ہے۔ مہمان کو آخر کار روانہ ہونا ہے اور عاریتاً لیا ہوا سامان واپس کرنا ہے۔ دنیا حاضر مال ہے جس میں نیک یا بد ہر ایک حصہ لیتا ہے۔ یہ اللہ والوں کے لیے ناپسندیدہ اور دنیا داروں کے لیے پسندیدہ ہے اور جو شخص ان کی پیاری چیز میں شریک ہوگا تو یہ لوگ اس سے دشمنی اور حسد کریں گے۔''

جیسے اوپر بیان ہوا کہ دنیا کمانا، رکھنا اور استعمال کرنا جائز بلکہ افضل ہے' البتہ اس سے محبت کرنا، دل لگانا، اسے اپنی ضروریات پر، اپنے اہل وعیال پر اور اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنا گناہ اور دنیا داری ہے۔ مذکورہ بالا حدیث میں دراصل اسی چیز سے روکا گیا ہے۔

(ھ) دنیا حاصل ہونے پر شکر کرنا جو زبان دل اور عمل سے ہوتا ہے، عمل کی اہم صورت اللہ

کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔ تکبر، بڑائی اور نمائش سے بچنا لازم ہے۔ قارون نے تکبر وغرور کیا اور ناشکری کی تو سخت عذاب میں گرفتار ہوا اور قیامت تک کے لیے لعنتی بن گیا۔

(و) جس آدمی کے پاس دنیا کا مال زیادہ ہے اس پر دینی و دنیاوی ذمہ داریاں زیادہ ہیں اور دنیا و آخرت میں جواب دہی بھی سخت ہوگی اس کے برخلاف جس کے پاس رزق بقدر ضرورت وکفایت ہے، وہ دنیا و آخرت کی ذمہ داری اور جواب دہی سے ہلکا اور بَری ہوگا۔ انسان کو دنیا اتنی ہی ملے گی جتنی اس کی قسمت میں لکھی ہوگی۔

نبی ﷺ نے فرمایا ''جس شخص کی فکر آخرت کے لیے ہوگی تو اللہ تعالیٰ اس کے کام آسان کرے گا اس کے دل میں تونگری اور استغنا ڈالے گا اور دنیا اس کے پاس ذلیل ہو کر آئے گی اور جس کی سوچ وفکر دنیا کے لیے ہوگی تو اللہ تعالیٰ اس کے کاموں کو پھیلا دے گا، اسے محتاجی سامنے نظر آئے گی اور دنیا بھی اتنی ہی ملے گی جتنی اس کی قسمت میں لکھی ہوئی ہوگی۔''

حدیث میں دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے دل سے دنیا کی محبت نکال دینا چاہیے، ایک دل میں ایک ہی وقت میں اللہ کی محبت اور مال کی محبت دونوں جمع نہیں سکتیں اس لیے جب مال کی محبت نکالی جائے گی تب ہی اللہ کی محبت اس میں گھر کرے گی اور اللہ تعالیٰ راضی ہوگا۔ ایک حدیث میں ہے:

حُبَ الدُّنیَا رَأْسُ کُلِّ خَطِیْئَۃٍ.

''یعنی دنیا کی محبت ہر گناہ کا سرا ہے۔''

لہٰذا اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے دنیا سے منہ پھیرنا ضروری ہے، دوسری حدیث میں ہے زاہد (دنیا سے منہ پھیر کر) اپنے دل کو دنیا اور آخرت میں راحت پہنچاتا ہے اور دنیا میں مگن رہنے والا اپنے دل کو تکلیف میں ڈالتا ہے۔

لوگوں سے اچھے تعلقات اور ان کی محبت حاصل کرنے کے لیے نبی ﷺ نے فرمایا ''ان کے دنیاوی معاملات اور کاروبار سے حسد اور جلن کا رویہ نہ ہو، ان سے مالی امید نہ رکھی جائے، ان کے مال پر آنکھیں نہ گاڑھی جائیں تو ایسے شخص سے لوگ محبت کرتے ہیں۔

ہام لوگوں میں ایک دوسرے سے نفرت، بغض کینہ، حسد، جلن اور عصبیت کا بڑا سبب کاروباری معاملات ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے حقوق کا لحاظ نہ کرنا بلکہ ایک دوسرے کے حقوق کو چھیننا ہی نفرت کا سبب ہوتا ہے۔ کاروبار میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنا بغض اور کینہ کا سبب بنتا ہے، طبقہ واریت کے نظام ان ہی سے جنم لیتے ہیں اس لیے آپ نے اصولی بات یہ بتائی کہ لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے منہ موڑ لو تو لوگ تم سے محبت کرنے لگیں گے۔

ایک دوسری حدیث میں نبیؐ نے انسان کو ذہنی سکون اور راحت حاصل کرنے کا گر یہ نایا کہ لوگوں کے ہاتھوں میں جو کچھ ہے یعنی مال ودولت، عہدے اور مرتبے ان سے تم ایوس ہو جاؤ یعنی ان کے حاصل کرنے کی امید اور آس نہ رکھو اس طرح تم میں اطمینان اور قناعت پیدا ہوگی جو تمہیں راحت پہنچائے گی اور تمہیں ذہنی سکون حاصل ہوگا۔ ( )

آج ہم دنیا کے بارے میں حضورﷺ کا مذکورہ بالا فرمان سامنے رکھیں اور اپنی زندگی س کے مطابق گزاریں تو اللہ کی رضا بھی حاصل ہوگی اور لوگوں سے اچھے اور بہتر تعلقات قائم رہیں گے بلکہ ان سے بڑھ کر پیار ومحبت، ہمدردی وغم خواری کے تعلقات قائم ہوں گے اور زندگی خوش گوار گزرے گی۔

حدیث نمبر 32

اسلام میں نقصان نہیں

عَنْ أَبِیْ سَعِیْدٍ سَعْدِ بْنِ مَالِکِ بْنِ سِنَانِ الْخُدْرِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: لَاضَرَرَ وَلَاضِرَارَ" حَدِیْثٌ حَسَنٌ رَوَاہُ ابْنُ مَاجَۃَ وَالدَّارُ قُطْنِیُّ وَغَیْرُھُمَا مُسْنَدًا. وَرَوَاہُ مَالِکٌ فِی الْمُؤَطَّا مُرْسَلاً عَنْ عَمْرِوبْنِ یَحْیٰی عَنْ أَبِیْہِ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ فَاَسْقَطَ أَبَا سَعِیْدٍ وَلَہٗ طُرُقٌ یُقَوِّیْ بَعْضُھَا بَعْضًا.

''حضرت ابوسعید سعد بن مالک بن سنان خدری روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اسلام میں کسی کو نقصان اور تکلیف پہنچانے کی اجازت نہیں ہے۔''

تشریح:

یہ حدیث جوامع الکلم میں سے ہے اور اسلام کے اصولی قاعدوں میں سے ایک ا[ہم] قاعدہ بیان کرتی ہے۔ ابوداوُدؒ نے کہا ہے کہ فقہ کے متعدد قاعدے جن پانچ حدیثوں [سے] نکلتے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے۔ فقیہوں اور اصولیوں نے اس میں سے کتنے ہی فرو[عی] قاعدے اور قانون نکالے ہیں، یہ قواعد فقہ اور اصول فقہ کی کتابوں میں تفصیل سے معلو[م] کیے جا سکتے ہیں۔

حدیث میں دو لفظ ا[ٓ]ئے ہیں: ایک ''ضرر'' ج[س] کے معنی ہیں، کسی ایسے شخص کو نقصا[ن] پہنچانا جس نے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے، دوسرا لفظ ''ضرار'' ہے، اسے بعض راویو[ں] اور فقیہوں نے اضرار بھی پڑھا ہے لیکن عام مشہور ضرار ہی ہے جو بابِ مفاعلۃ کا ایک مصد[ر]

ہے جیسے قتال، مرار، علاج اور عقاب وغیرہ۔ اس کے معنی ہیں ایک دوسرے کو نقصان پہنچانا یا نقصان کے درپے ہونا۔

اسلام اور ایمان اپنے الفاظ سے امن وسلامتی ظاہر کرتے ہیں، ان ہی سے مسلم اور مومن کے کلمات بنے ہیں جو بتاتے ہیں کہ مومن امن وسلامتی کا مجسم ہوتا ہے، بدامنی، بے ایمانی، دھوکے اور ٹھگی اور خیانت سے دُور رہتا ہے اور ظلم وزیادتی سے عاری ہوتا ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھیے حدیث نمبر ۲۴)

ایک حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

اِنَّ دَمَاءَ کُمْ وَاَمْوَالَکُمْ وَاَعْرَاضَکُمْ عَلَیْکُمْ حَرَامٌ. (بخاری)

''تمہارے خون (جانیں) تمہارے مال اور تمہاری عزتیں تم پر حرام ہیں۔''

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ. (صحیح بخاری)

''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں ہوسکتا جب تک اپنے بھائی کے لیے بھی وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔''

جس دین میں اتنی جامع اور واضح ہدایات موجود ہیں، اس میں کسی کو نقصان پہنچانا اور تکلیف دینے کی گنجائش کہاں ہوگی۔

ایک دوسرے کو مالی نقصان نہ پہنچانے کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَکُمْ رُؤُسُ اَمْوَالِکُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ.

(البقرہ۲:۲۷۹)

''اور اگر تم توبہ کرلو تو اپنا اصل سرمایہ لینے کے تم حق دار ہو نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر کوئی ظلم کیا جائے۔''

یعنی نہ تم کسی کو رنج پہنچاؤ اور نہ تمہیں کوئی رنج پہنچائے، نہ تم کسی کا مال ہڑپ کرو اور نہ تمہارا کوئی مال ہڑپ کرے لیکن اگر کوئی تمہیں دُکھ دیتا ہے اور گالی گلوچ کرتا ہے یا تکلیف دیتا ہے تو شریعتِ مطہرہ کے موجب تم اپنے طور پر کوئی کارروائی نہ کرو البتہ حاکم وقت کے پاس یا کسی قاضی یا ثالث کے پاس فیصلہ لے کر جاؤ اور ان کے ذریعے اپنا حق وصول کرو۔

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

لِلْمُسْتَابَّيْنِ مَاقَالاَ وَعَلَى الْبَادِیْ مِنْهُمَاالْاِثْمُ مَالَمْ يَعْتَدِ الْمَظْلُوْمُ.

(رواہ مسلم)

''دونوں گالیاں دینے والوں کے لیے وہی (وبال) ہے جو انہوں نے ایک دوسرے کو کہا ہے اور ان میں سے پہل کرنے والے پر گناہ ہے جب تک مظلوم کسی اور وجہ سے زیادتی نہ کرے۔''

آج ہمارے معاشرے میں مسلمانوں کا عمل اور رویہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ مسلم قوم کو کیا ہو گیا ہے کہ ایک دوسرے سے جھگڑے، دشمنیاں اور مخاصمتیں قائم کیے ہوئے ہیں۔ حکمرانوں، لیڈروں اور رہنماؤں سے لے کر عوام تک اپنی طاقت، دولت، وقت اور تمام صلاحیتیں ایک دوسرے کو دبانے، نیچا دکھانے اور ایک دوسرے کے حقوق مارنے میں خرچ کر رہے ہیں جس گروہ کو جب موقع ملتا ہے اور اقتدار اور حکومت ملتی ہے تو دوسرے گروہ سے انتقام لینے میں لگ جاتا ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آج اُمتِ مسلمہ کی پستی، زوال اور ذلت کا اہم سبب بھی یہی ہے کہ تمام اُمت ایک فرد سے لے کر گروہوں، جماعتوں اور حکومتوں تک اس بیماری میں مبتلا ہے: پھر افسوس اس بات کا ہے کہ مسلم اُمت نے اپنی باگیں دوسری اقوام کے ہاتھوں میں دے دی ہیں یعنی یہود، نصاریٰ اور ہنود کی سازشوں کا شکار ہوگئی ہے۔ وہ جیسے چاہتے ہیں، انہیں آپس میں لڑا دیتے ہیں، قرضوں کے جال میں پھنسا دیتے ہیں، الحاد، بے دینی اور شہوت پرستی کے چکر میں ڈال کر ان کا دین و دنیا دونوں برباد کر دیتے ہیں۔

اُمت کے ہر فرد کو اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی پر نظر ڈال کر سوچنا چاہیے کہ میرا مقام کون سا ہے، میری ذمہ داری کیا ہے اور مجھے زندگی کس طرح گزارنی ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ کس طرح رہنا ہے۔ اس طرح زندگی گزارنے کا ایک اصول لاضرر ولاضرار ہے۔

حدیث نمبر 33

فیصلے کرنے کے لیے ایک اہم قاعدہ

عَنْ أَبِیْ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: لَوْ یُعْطَی النَّاسُ بِدَعْوَاھُمْ، لَادَّعٰی رِجَالٌ أَمْوَالَ قَوْمٍ وَدِمَاءَ ھُمْ، لٰکِنِ الْبَیِّنَۃُ عَلَی الْمُدَّعِیْ وَالْیَمِیْنُ عَلٰی مَنْ أَنْکَرَ" حَدِیْثٌ حَسَنٌ رَوَاہُ الْبَیْھَقِیُّ وَغَیْرُہٗ ھٰکَذَا وَبَعْضُہٗ فِی الصَّحِیْحَیْنِ.

"حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشادفرمایا" اگر محض دعویٰ کی بنیاد پر لوگوں کا حق تسلیم کر کے ان کو دے دیا جائے تو لوگ دوسروں کے مالوں اور جانوں کے بارے میں اکثر دعویٰ کرنے لگیں لیکن قاعدہ یہ ہے کہ گواہ لانا مدعی کے ذمہ ہے اور قسم اُٹھانا منکر (انکاری/مدعی علیہ) کے ذمہ ہے۔"

تشریح:

یہ حدیث بھی جوامع الکلم احادیث میں سے ہے جس میں دعووں، مقدموں، جھگڑوں کے فیصلے کرنے کے بارے میں ایک اہم اصولی قاعدہ بیان کیا گیا ہے لہٰذا فیصلے کرنے میں اس پر عمل کیا جائے گا اور چند استثنائی صورتوں کے سوا ہر موقع میں اس پر عمل ہوگا۔ قاضیوں، ججوں، منصفوں، سرداروں اور ثالثوں کو یہ حدیث ایک رہنما اصول کے طور پر اپنے سامنے رکھنی چاہیے۔ حدیث کی تشریح کے بارے میں چند باتیں پیش کی جاتی ہیں:

(۱) مدعی (دعوے دار) کوئی دعویٰ لے کر آئے تو دعویٰ کے ثبوت کے لیے اس سے شاہد طلب کیے جائیں گے اس کے کئی پہلو ہیں: اوّل یہ کہ شریعت نے انسانوں میں

مساوات، برابری پیدا کرنے اور انصاف دلانے کے لیے ہر مدعی کو یکساں قرار دیا ہے اور اس بات کا لحاظ نہیں کیا کہ دعوے دار دینی، اخلاقی، مالی اور معاشرتی حیثیت سے کس درجے کا ہے' لہٰذا ہر مدعی سے اس کھلے دعویٰ کے ثبوت کے لیے گواہ طلب کیے ہیں حتیٰ کہ خلیفہ وقت حضرت علیؓ سے دعوے کے ثبوت کے لیے صحیح گواہ طلب کیے گئے اور انہوں نے دو گواہ پیش کیے لیکن قاضی شریح نے گواہی کے معیار پر پورا نہ اُترنے کی وجہ سے وہ رد کر دیئے اور مدعی علیہ کو بَری کر دیا۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ مدعی کسی انسان کے ذمے کسی حق کا دعویٰ کر کے اسے ملزم بنا رہا ہے جبکہ اسلام کا اصول یہ ہے کہ ہر انسان بَری الذمہ (براءۃ عن الحقوق) پیدا ہوا ہے۔ ہر انسان بے گناہ، بَری الذمہ اور معصوم ہے اس لیے اس کے ذمے کوئی الزام ثابت کرنے کے لیے قوی حجت (مضبوط دلیل) کی ضرورت ہے اور گواہی مضبوط ترین دلیل ہے۔

سوم یہ کہ اگر صرف کسی شخص کے دعویٰ سے فیصلہ کر دیا جائے تو کتنے ہی دعوے دار اُٹھ کر لوگوں کے مال ہڑپ کر جائیں گے اور بے انصافی عام ہو جائے گی، ان وجوہات کی بناء پر مدعی کے ذمے گواہ لانا لازم کر دیا گیا۔

البتہ چند دعوے ایسے ہیں جو بعض ناگزیر اسباب اور دوسری وجوہ کی بناء پر گواہ لائے بغیر ہی قبول کیے جائیں گے جیسے احتلام کے ذریعے بالغ ہونا، مخنث کا مرد یا عورت ہونا، مقروض کا ایسے قرض کی ادائیگی سے مفلس ہونے کا دعویٰ کرنا جو اس پر بغیر کسی مالی عوض کے لازم ہوا ہے جیسے مہر اور امانت کے چوری وغیرہ سے ضائع ہونے کا دعویٰ۔ ان باتوں اور دعووں کو بغیر شاہدوں کے قبول کر لیا جائے گا اس طرح کوئی شخص گھر میں نماز پڑھنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا دعویٰ کرے تو اسے بھی قبول کر لیا جائے گا۔

(۲) جب مدعی گواہ نہیں پیش کر سکتا تو پھر مدعی علیہ (الزام زدہ فریق) کو قسم اُٹھانے کے لیے کہا جائے گا چونکہ مدعی علیہ درحقیقت جرم سے بَری یعنی براءۃ عن الحقوق کے درجے میں ہے اس لیے اسے قسم اُٹھانے کے لیے کہا جائے گا جو کمزور دلیل ہے' کیونکہ اس کا الزام تسلیم نہ کرنا اس حقیقت کے قریب ہے کہ انسان اپنی اصلیت کے لحاظ سے معصوم اور بَری ہے۔

غیر اسلامی قوانین، عیسائیت، ہندومت اور دیگر کئی تہذیبیں اور معاشرے عام طور پر انسان کو اس وقت تک گناہ گار اور مجرم سمجھتے ہیں جب تک اپنے اوپر سے الزام دور کر کے پنے آپ کو بری ثابت نہ کر دے لیکن اسلام ہر انسان کو اس وقت تک شریف، بے قصور اور ی الزام قرار دیتا ہے جب تک اس کے ذمہ کوئی جرم ثابت نہ ہو جائے اگر اس پر کوئی جرم ابت نہیں ہوتا تو معتبر ہونے کی بناء پر قسم اُٹھا کر اپنے آپ کو بَری کر لے۔

۳) مدعیٰ علیہ کو نبی اکرم ﷺ نے ''انکار کرنے والا'' فرمایا ہے کیونکہ وہ الزام اور جرم قبول کرنے سے انکار کرتا ہے، اس نوع کی قسم کو شریعت میں یمین الصبر (صبر کی قسم) اور ''یمین غموس'' کہا جاتا ہے۔ ایسی قسم کے اُٹھانے میں جو جھوٹا ہو اور حقیقت کے خلاف قسم اُٹھائے اس کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا:

مَنْ حَلَفَ عَلٰی یَمِیْنِ صَبْرٍ یَقْتَطِعُ بِهٖ مَالَ امْرِءٍ مُسْلِمٍ هُوَ فِیْهَا فَاجِرٌ'' لَقِیَ اللّٰهَ وَهُوَ غَضْبَانُ.

''جس شخص نے صبر کی ایسی قسم اُٹھائی جس سے کسی مسلمان کے مال کو ہڑپ کرنا اور لُوٹنا چاہتا ہے اور وہ اس میں گناہ گار ہے تو (روزِ قیامت) اللہ سے ایسے حال میں ملے گا کہ وہ اس پر سخت ناراض ہوگا۔''

لہٰذا ایسی قسم اُٹھانے والے کو سوچ سمجھ کر قسم اُٹھانی چاہیے ایسا نہ ہو کہ تھوڑے سے فائدے کے لیے اپنی عاقبت برباد کر بیٹھے۔

(۴) فیصلے کرنے والوں کو یہ حدیث فیصلے کرتے وقت اپنے سامنے رکھنی چاہیے اور اس کے مطابق پہلے دعوے دار سے شاہد طلب کرنے چاہئیں اور اس پر زور دینا چاہیے لیکن اگر وہ شاہد نہ دے سکے تو پھر مدعیٰ علیہ (انکاری) سے قسم اُٹھانے کا مطالبہ کرنا اور قسم دینی چاہیے جب وہ قسم اُٹھا لے تو معاملہ طے کر دینا چاہیے۔ بہر حال یہ حدیث فیصلے میں بنیادی حیثیت اور اصولی رہنمائی رکھتی ہے۔

حدیث نمبر 34

بُرائی سے روکنا ایمان کا تقاضا

عَنْ أَبِی سَعِیدِ الْخُدْرِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ: مَنْ رَأٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ، فَإِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ، فَإِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ، وَذٰلِکَ أَضْعَفُ الْإِیْمَانِ. (رواہ مسلم)

''حضرت ابوسعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے فرماتے سنا ''تم میں سے جو شخص کوئی بُرائی دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے مٹائے' پھر اگر اسے اس کی طاقت نہیں ہے تو اپنی زبان سے روکے' پس اگر اس کی بھی اسے طاقت نہیں تو اپنے دل میں اسے بُرا سمجھے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔''

تشریح:

یہ حدیث دعوت و تبلیغ اور نہی عن المنکر کے بارے میں اصولی رہنمائی کرتی ہے اس لیے اسے تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دعوت و تبلیغ کا ایک اہم جز ہے۔

دینِ اسلام خیر و بھلائی کا دین ہے اور مسلم اُمت کو دنیا میں اس لیے بھیجا گیا ہے کہ وہ نیکی پھیلائے اور بُرائی کو ختم کرے تاکہ انسان دنیا میں امن و سلامتی کی زندگی گزارے اور زور و جبر اور دُکھ تکلیف سے بے فکر ہو کر رہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ. (آل عمران ۳:۱۱۰)

''تم بہترین اُمت ہو جسے لوگوں (کی ہدایت اور رہنمائی) کے لیے لایا گیا

ہے تاکہ نیکی کا حکم کرو اور بُرائی سے روکو اور اللہ پر ایمان لاؤ۔''

اس طرح سورۂ بقرہ کی آیت ۱۴۳ میں بھی اس کو بہتر اُمت کہا گیا ہے، پھر اس اُمت کے افراد (مومنوں) کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

''مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں، نیکی کا حکم کرتے ہیں اور بُرائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرتے ہیں، ان ہی پر اللہ رحم فرمائے گا۔'' (التوبہ۹:۷۱)

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ صرف اُمت کی اجتماعی اور عمومی ذمہ داری ہے بلکہ اُمت کے افراد کی انفرادی ذمہ داری بھی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَلْآمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ. (التوبہ۹:۱۱۲)

''نیکی کا حکم دینے والے اور بُرائی سے روکنے والے۔''

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت لقمان کی وہ نصیحت بیان کی ہے جو انہوں نے اپنے بیٹے کو کی تھی:

يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ. (لقمان۳۱:۱۷)

''اے میرے بیٹے! نماز قائم کر اور نیکی کا حکم دے اور بُرائی سے روک اور اس راہ میں جو تکلیف پہنچے اس پر صبر کر، بلاشبہ یہ اہم کاموں میں سے ہیں۔''

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں نبی ﷺ کی متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں جو احادیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔ ہم یہاں پر صرف دو حدیثیں بیان کرتے ہیں:

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ ...... فَجلَسَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ مُتَّكِئًا فَقَالَ: لَا، وَالَّذِىْ نَفْسِىْ بِيَدِهٖ لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَلَتَاْخُذُنَّ عَلٰى يَدِى الظالم وَلَتَأْطُرُنَّهٗ عَلَى الْحَقِّ اِطْرًا اَوْلَيَضْرِبَنَّ اللهُ بِقُلُوْبِ بَعْضِكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ثُمَّ لَيَلْعَنُكُمْ كَمَا لَعَنَهُمْ. (بیہقی بحوالہ مشکوٰۃ)

''حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ٹیک لگائے بیٹھے ہوئے تھے پھر سیدھے بیٹھ گئے اور فرمایا ''نہیں! اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، تم ضرور لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے رہو گے اور بُرائی سے روکتے رہو گے اور ظالم کا ہاتھ پکڑو گے اور ظالم کو حق پر جھکاؤ گے اگر تم لوگ ایسا نہیں کرو گے تو تم سب کے دل بھی ایک ہی طرح کے ہو جائیں گے اور پھر اللہ تم کو اپنی رحمت سے دُور پھینک دے گا جس طرح بنی اسرائیل کے ساتھ اس نے معاملہ کیا۔''

مسلم اُمت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض ادا کرتی رہے اور ظالموں کو ظلم سے روکتی رہے تو دونوں جہانوں کی نجات حاصل ہوگی ورنہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اس طرح دُور ہو جائے گی جیسے بنی اسرائیل دُور ہوگئی تھی۔ نبی ﷺ نے اس کام کی اہمیت اور فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

''حضرت ابوسعید خدریؓ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''ظالم اور جابر اقتدار اور قوت کے سامنے حق کا کلمہ (بات) کہنا افضل جہاد ہے۔''

اُمتِ محمدیہؐ کے ہر دور میں انفرادی طور پر ایسے شخص رہے ہیں جنہوں نے یہ فرض ادا کیا ہے اور اس راہ میں آنے والی تکالیف جھیلی ہیں۔ کتنے حضرات نے اپنی جانیں تک قربان کی ہیں لیکن اس فرض کی ادائیگی سے پیچھے نہیں ہٹے، اس کام کی ادائیگی کے لیے اجتماعی کوششیں بھی کی ہیں' البتہ آج کے اس دور میں اس فرض کی ادائیگی میں کافی کوتاہی ہو رہی ہے اس کوتاہی کے مختلف اسباب ہیں جیسے اس بارے میں آمدہ آیات واحادیث کی تاویل کرنا، انسانوں کا ڈر، دنیاوی لالچ وحرص، آرام وعیش پرستی، اللہ کی راہ میں تکلیفیں جھیلنے سے کترانا اور مغربی وملحد لوگوں کا پروپیگنڈہ وغیرہ۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا دائرہ بہت وسیع ہے یعنی ایک فرد، ایک گھر کے بڑے، رئیس، سردار، حاکم سے لے کر تنظیموں برادریوں، جماعتوں، تحریکوں اور حکومت تک پھیلا ہوا ہے۔ ہر شخص اور ہر تنظیم پر اس کی طاقت، اختیار واقتدار کے مطابق اسے سرانجام دینا فرض

ہے۔

علمائے کرام نے اس فریضہ کو فرض عین بھی کہا ہے اور فرضِ کفایہ بھی۔ فرض عین اس لحاظ سے ہے کہ ہر فرد جو گھر کا بڑا ہے اس کے چند افراد جو ماتحت ہیں، جو اس کے گھر میں پلتے ہیں اور کھاتے ہیں، انہیں نماز، روزے، دین کی بنیادی باتوں کے ادا کرنے کا حکم دے اور شریعت کی طرف سے حرام کردہ باتوں اور کاموں سے روکے' البتہ یہ کام اجتماعی طور پر فرضِ کفایہ ہے یعنی اگر کچھ جماعتیں، تنظیمیں اور حکومتی ادارے یہ کام کریں تو باقی لوگوں سے یہ فرض ساقط ہو جائے گا لیکن ایسے ادارے، تنظیمیں اور ایسی حکومت قائم کرنے کے لیے جدوجہد اور کوشش کرنا ضروری ہے تاکہ دین کے تمام احکام قائم و جاری ہوں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی اور بُرائیاں ختم ہوں اور پورا اسلامی نظام قائم ہو جائے' اگر ایسے ادارے نہیں ہیں اور نہ ہی ایسے اداروں کے قیام کی کوشش ہو رہی ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام نہیں ہو رہا تو پوری اُمت مجرم ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. (آل عمران ۳:۱۰۴)

''تم میں سے ایک اُمت ایسی ضرور ہونی چاہیے جو نیکی کی طرف بُلائے اور نیکی کا حکم دے اور بُرائی سے روکے اور وہی لوگ کامیاب ہیں۔''

یہ آیتِ کریمہ صاف بتاتی ہے کہ یہ کام انفرادی کے ساتھ ساتھ اجتماعی پیمانے پر بھی ہونا چاہیے اور اس سے غفلت نہ برتی جائے اس کام کے بارے میں ایک سوال یہ سامنے آتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کون سی باتوں اور کاموں کا ہونا چاہیے اس لیے کہ شریعت کے دائرے میں بہت سی باتیں اور اعمال شامل ہیں پھر ان میں اچھی خاصی باتیں اختلافی ہیں۔

علمائے کرام کہتے ہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں وہ باتیں آتی ہیں جو فرض، واجب اور سنتِ مؤکدہ ہیں یا حرام، ممنوع اور مکروہ تحریمی ہیں اور اُمت میں متفق علیہ ہیں' البتہ شریعت کی جو باتیں صحیح تاویل و تعبیر کی وجہ سے مختلف فیہ ہیں اور مجتہدین، ائمہ اور

مسلکوں کی وجہ سے مختلف فیہ ہوگئی ہیں، وہ امر اور نہی کے دائرے میں نہیں آتیں، یہ باتیں تعلیم کے دائرے میں آتی ہیں۔مختلف مسلکوں کے لوگ ان کی تعلیم دیں گے اور ان مسلکوں کے پیروکار اس کی تعلیم لیں گے۔ یہ مختلف فیہ باتیں نہ تو حکماً نافذ کی جائیں گی اور نہ ہی ان کو منکر قرار دے کر ان سے روکا جائے گا' اسی طرح ان باتوں پر بحث ومباحثے اور مناظرے بھی تحقیق کی غرض سے ہوں گے جو صرف خاص علمی حلقوں تک محدود ہوں گے' ان پر پوسٹر چھاپنا، عام مناظرے کرنا، ان کو تسلیم نہ کرنے والوں کو گمراہ کہنا صحیح نہیں ہے' کیونکہ ان کے دونوں پہلو اور مسلک صحیح تعبیر وتاویل سے ثابت ہوتے ہیں اور دین کے دائرے میں آتے ہیں جیسے رفع یدین اور امین بالجہر بھی دین ہے اور عدم رفع یدین اور آمین بالسر بھی دین ہے اس طرح دین کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

حدیث زیر مطالعہ میں نہی عن المنکر کے تین درجے بیان کیے گئے ہیں، ان پر عمل کرنے کی ایک صورت اس مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔ایک شخص کوئی ناجائز کاروبار کر رہا ہے، اس حالت میں حکومت کی طرف سے مقرر کردہ ادارے اور ایجنسی کو طاقت (کیس درج کرنا، گرفتاری، چالان اور سزا) کے ذریعے روکنا ضروری ہے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ مارکیٹ کے ذمہ دار اور بڑے اس کو زبان سے ضرور سمجھائیں۔ تیسرا درجہ کمزوروں، ضعیفوں اور بے بسوں کا ہے کہ اسے اپنے دل میں بُرا سمجھیں۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے والوں کے لیے لوگوں کی نجی زندگی میں دخل دینا، تحقیق وتفتیش کرنا، حالات کا تجسس کرنا جائز نہیں ہے' البتہ کوئی قابلِ بھروسہ شخص کسی جرم کے ہونے کی اطلاع دے اور فساد بڑھنے کا اندیشہ ہو تو تحقیق وتفتیش کی جاسکتی ہے۔

شیخ محی الدین نے لکھا ہے کہ لوگ اس فرض کی ادائیگی میں کوتاہی، سستی اور بے پرواہی برتتے ہیں جبکہ اسلام کا یہ اہم عمل ہے۔ اس سے معاشرہ اسلام پر قائم رہتا ہے، بُرائیاں دَب جاتی ہیں اور اللہ کی رحمت نازل ہوتی ہے۔ دوسری صورت میں ایسی قوم پر خدائی عذاب نازل ہوتا ہے جس میں نیک وبد سب گرفتار ہوتے ہیں اور گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''پس ضرور ڈرنا چاہیے ان لوگوں کو جو اس کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں کہ انہیں فتنہ لپیٹ میں لے لے یا ان پر دردناک عذاب نازل ہو۔'' (النور:۶۳)

اوپر بیان کردہ حدیث پر عمل کرنے کے لیے علماء نے طریقہ یہ بتایا ہے کہ مومن پہلے منکرات، منہیات اور بُرائیوں کی ممانعت کا یقین کرے، انہیں دل میں بُرا سمجھے پھر ان میں مبتلا اشخاص کو تنہائی میں حکمت اور نرمی سے سمجھائے۔ امام شافعیؒ نے کہا ''جس شخص نے اپنے بھائی کو تنہائی میں نصیحت کی اس نے اس سے خیر خواہی اور بھلائی کی اور جس نے اسے سرِعام کہا اس نے اسے بدنام کیا' لیکن اس سے بھی وہ نہ سمجھے اور نہ مانے تو پھر عام زبان سے فرمائش کرے اور روکے تاکہ وہ بھی رُکے اور دوسرے لوگ اس سے باخبر ہوں لیکن اگر اس سے بھی نہ رُکے تو اگر وہ صاحبِ طاقت واقتدار ہے تو طاقت سے روکے (طاقت کے بارے میں اوپر بیان ہوا ہے) مسلمان اس فریضے کی ادائیگی کے لیے ہمت وجرأت اور بہادری سے کام لے، کسی بڑے کی بڑائی، دولت مند کی دولت اور طاقت ور کی طاقت کی پرواہ نہ کرے اور نہ دوست کی دوستی اور محسن کے احسان کا خیال کرے بلکہ اس کی خیر خواہی اور بھلائی اور ہمدردی سمجھ کر حق بتائے۔

حدیث نمبر 35

مسلمانوں کے باہمی حقوق

عَنْ أَبِی هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: ”لاَ تَحَاسَدُوْا، وَلاَ تَنَاجَشُوْا، وَلاَ تَبَاغَضُوْا، وَلاَ تَدَابَرُوْا، وَلاَ یَبِعْ بَعْضُکُمْ عَلٰی بَیْعِ بَعْضٍ، وَکُوْنُوْا عِبَادَ اللهِ اِخْوَانًا اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ لاَ یَظْلِمُهٗ وَلاَ یَخْذُلُهٗ، وَلاَ یَکْذِبُهٗ وَلاَ یَحْقِرُهٗ، اَلتَّقْوٰی هٰهُنَا، وَیُشِیْرُ إِلٰی صَدْرِهٖ ثَلاَثَ مَرَّاتٍ، بِحَسْبِ امْرِیءٍ مِنَ الشَّرِّ اَنْ یَحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ، کُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَی الْمُسْلِمِ حَرَامٌ، دَمُهٗ وَمَالُهٗ وَعِرْضُهٗ.“ (رواہ مسلم)

”حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”ایک دوسرے سے حسد نہ کرو، ایک دوسرے کے مقابلے میں بھاؤ نہ بڑھاؤ، آپس میں بغض نہ رکھو، ایک دوسرے سے منہ نہ موڑو، ایک شخص دوسرے کے سودے پر سودا نہ کرے اور اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن کر رہو۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر ظلم کرے، نہ اس کو بے کسی کی حالت میں چھوڑے، نہ اس سے جھوٹ بولے، نہ اسے حقیر جانے۔“ پھر آپ ﷺ نے تین بار اپنے سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ”تقویٰ یہاں ہے، یہاں ہے، یہاں ہے۔ انسان کے بُرا ہونے کے لیے کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر جانے، مسلمان کے لیے مسلمان کا سب کچھ حرام ہے اس کا خون بھی، مال بھی اور آبرو بھی“۔

تشریح:

یہ حدیث بھی ان جامع احادیث میں سے ہے جن میں انفرادی، اجتماعی، معاشرتی، معاشی اور اخلاقی زندگی کے بارے میں اصولی ہدایات دی گئی ہیں۔ مسلمان اور مسلمان معاشرے کے افراد ان باتوں پر عمل کریں تو دنیا و آخرت دونوں جہانوں کی بھلائی انہیں نصیب ہوگی، کتنی ہی معاشرتی بُرائیاں ختم ہو جائیں گی، بہت سے جھگڑے ختم ہو جائیں گے اور مسلمان باہمی شیر وشکر بن جائیں گے۔ حدیث زیر مطالعہ میں آمدہ باتوں کی قدرے تفصیل سے تشریح کی جاتی ہے۔

(۱) حسد:

انسان کی اخلاقی بیماریوں میں سے ایک بیماری حسد ہے۔ قرآن مجید کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حسد کافروں، منافقوں اور یہودیوں کی صفت ہے اور مسلمان کے لیے حسد کرنا حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفلق میں حاسد کے شر سے پناہ مانگنے کے لیے فرمایا ہے۔ اور حدیث شریف میں آیا ہے:

''اپنے آپ کو حسد سے بچاؤ کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح بھسم کر دیتا ہے جیسے لکڑیوں کو آگ بھسم کر دیتی ہے۔'' (ابوداؤد)

(۲) تناجش بولی پر بولی لگانا:

تناجش اس کا مادہ نجش ہے جس کے معنی ہیں دوسرے سے بڑھ کر بولی لگانا اس کی کئی صورتیں: ایک یہ ہے کہ خرید وفروخت میں جھوٹی بولی لگانا تا کہ انجان اور ناواقف لوگ اس میں شریک ہو جائیں اور دھوکہ کھا کر مہنگے بھاؤ پر چیز خرید لیں۔ بناوٹی گاہک پیش کرنا جبکہ ان کو خریدنا نہ ہو، اس طرح کے کئی ایسے طریقے جن میں ٹھگی اور دھوکہ ہو، سب حرام ہیں۔

(۳) تباغض اور تدابر:

مسلمان کا دوسرے مسلمان سے بغض رکھنا حرام ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے ''کسی مسلمان کے لیے حلال (جائز) نہیں ہے کہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ تعلقات

توڑے رکھے اور جب یہ دونوں آمنے سامنے ہوں تو ایک دوسرے سے منہ موڑ لیں، ان دونوں میں اچھا وہ ہے جو سلام کرنے اور بات کرنے میں پہل کرے۔'' (ترمذی)

(۴) کسی کے سودے پر سودا کرنا:

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص نے سودا پکا کرلیا ہے یا کوئی شخص کسی تاجر سے سودا کر رہا ہے اور ان کے درمیان بھاؤ اور شرائط ہو چکی ہیں، دونوں فریق راضی ہوں یا کسی نے سودا کرلیا ہے اور خیار (اختیار) کی مدت ومہلت لی تو ان حالتوں میں خریدار یا بیچنے والے کو ورغلانا اور سودا خراب کرنا خلافِ شرع ہے' البتہ بھاؤ طے کرنے اور رضا مندی ظاہر کرنے سے پہلے درمیان میں آنا حرام تو نہیں ہے لیکن پھر بھی مناسب نہیں ہے اور اچھے اخلاق کے خلاف ہے۔

(۵) اُخوّت (بھائی چارہ):

مسلمانوں کے درمیان تعلقات بھائیوں والے ہونے چاہئیں۔قرآن مجید میں ارشاد ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ. (الحجرات:۱۰)

''مومن تو آپس میں بھائی ہیں۔''

اس لیے آپس میں تعلقات بھائیوں والے ہونے چاہئیں۔ضرورت کے وقت ایک دوسرے سے تعاون کرنا، مدد کرنا، مشکل وقت میں ایک دوسرے کے کام آنا، ان کی عزت کی حفاظت کرنا اور احترام کرنا، ایک مومن کا دوسرے مومن پر حق ہے' اس طرح جب کوئی مومن اپنی مصیبت میں جائز مدد کے لیے پکارے تو اس کی پکار سننا اور اپنی بساط کے مطابق مدد کرنا بڑا ثواب کا کام ہے اور اس کے ساتھ اس کے حق کی ادائیگی بھی ہے۔

(۶) ذلیل نہ کرے:

اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنی جگہ عام طور پر اور مسلمان خاص طور پر عزت کا حق دار ہے۔ چاہے غریب ہو یا امیر، عالم ہو یا جاہل، عامی ہو یا خاص، چھوٹا ہو یا بڑا، ہر شخص کے اپنے خیالات وجذبات ہیں۔ شخصیت ہے، عزتِ نفس ہے۔ اس لیے ہر شخص کی

عزت واحترام کا لحاظ رکھا جائے گا، وعظ ونصیحت میں، لین دین کرنے میں، کام کاج میں، بات چیت میں مومن کو خوار وذلیل نہیں کیا جائے گا، بے جا عیب نہیں بیان کیے جائیں گے حتیٰ کہ ہنسی مذاق اور مزاح میں بھی عزتِ نفس کا خیال رکھا جائے گا۔ ہر شخص کو اچھی نگاہ سے دیکھا جائے گا اگر کوئی عمر میں چھوٹا ہے تو یہ گمان کیا جائے گا کہ اس کے گناہ مجھ سے کم ہوں گے، اگر بڑا ہو تو یہ خیال کیا جائے گا کہ اس کی نیکیاں مجھ سے زیادہ ہوں گی اور اگر کافر کو دیکھے تو بھی یہ گمان کرے کہ ہوسکتا ہے کہ خدا اسے اسلام نصیب کرے اور مسلمان ہو کر مرے۔

نبی ﷺ نے ایسے آدمی کو نہایت بُرا اور آخرت میں سزا کے لائق قرار دیا ہے جو دوسروں کو بے عزت اور ذلیل کرتا پھرے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے اپنے اصحاب کرامؓ سے پوچھا ''بتاؤ مفلس کون ہے؟'' صحابہؓ نے جواب دیا ''ہم مفلس اس شخص کو کہتے ہیں جس کے پاس درہم ودینار نہ ہوں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا ''میری اُمت میں مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن ایسی حالت میں حاضر ہو کہ اس کے پاس زیادہ نیکیاں ہوں لیکن دنیا میں اس نے کسی کی مار پٹائی کی ہو، کسی کو گالیاں دی ہوں، کسی کا مال ہضم کیا ہو پھر اس کی نیکیاں لے کر ان لوگوں کو دی جائیں گی اور وہ مفلس (کنگال) رہ جائے گا۔'' (ریاض الصالحین)

(۷) تقویٰ:

آپ ﷺ نے اپنے سینے مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ''تقویٰ یعنی دل کی کیفیت کا نام ہے اس کا واسطہ ظاہر سے زیادہ دل وضمیر اور اندر سے ہے۔ بعض لوگ ظاہری وضع قطع اور بیرونی بناوٹ وسجاوٹ دیکھ کر کہتے ہیں کہ یہ بڑا متقی ہے حالانکہ تقویٰ کا واسطہ بیرونی نمائش سے کم ہے اور اندر سے زیادہ ہے۔ ان الفاظ سے آپ ﷺ کا ایک اشارہ اس طرف بھی ہے کہ کسی کو ظاہری خستہ حالت میں دیکھ کر حقیر اور کم نہ سمجھا جائے، ہو سکتا ہے کہ اندر میں جواہر پوشیدہ ہوں اسی طرح کسی کی ظاہری وضع قطع دیکھ کر اس کے متقی ہونے کا فیصلہ نہ دیا جائے۔ ہوسکتا ہے کہ بقول شاہ بھٹائی کے ''منہ تو موسیٰ جیسا ہو اور اندر کا ابلیس ہو۔''

(۸) باہمی احترام:

آخر میں آپ ﷺ نے فرمایا ''مسلمان کا مسلمان پر خون، مال اور آبرو حرام ہے۔ اسلامی معاشرے اور اسلامی حکومت میں مسلمان کی جان، مال، عزت اور آبرو کی پوری طرح حفاظت کی جاتی ہے۔ نبی ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبے میں ان تینوں چیزوں کی حفاظت کرنے کی اہمیت وعظمت بیان کرتے ہوئے فرمایا ''تمہارے خون (جانیں)، تمہارے مال اور تمہاری عزتیں اور آبرو ایسے محترم ہیں جیسے آج کا دن (نو ذوالحج) یہ مہینہ (ذوالحج) اور یہ شہر (مکہ مکرمہ) واجب الاحترام ہیں۔'' (متفق علیہ) ان تینوں کے احترام میں کوتاہی کرنا حرام اور گناہ ہے اسی طرح ایک مسلمان کی جان، مال اور عزت وآبرو کا درجہ ہے۔

قرآن وحدیث کی تمام تعلیم اس بات کو واضح کرتی ہے کہ مسلمانوں کے باہمی کون کون سے حقوق ہیں، ان کی کتنی اہمیت ہے اور یہ کتنے ضروری ہیں پھر ان کی ادائیگی میں کوتاہی کرنا کتنا بڑا گناہ ہے۔ یہ تو توبہ سے معاف ہوتے ہیں اور نہ حج یا کسی اور نیکی کی ادائیگی سے ان کی کمی پوری ہوسکتی ہے' لہٰذا ہم مسلمانوں کو ضرور ان باتوں کی طرف توجہ دینی چاہیے اور بہت کوشش کرنی چاہیے کہ بندوں کے حقوق (حقوق العباد) میں کوئی کوتاہی نہ ہو اس طرح ہم دنیا وآخرت کی خواری وذلت سے بچ سکتے ہیں۔

حدیث نمبر 36

خدمتِ خلق اور حصولِ علم

عَنْ أَبِی هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُؤْمِنٍ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ الدُّنْيَا نَفَّسَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ يَسَّرَ عَلٰی مُعْسِرٍ يَسَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِی الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ فِی الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ' وَاللّٰهُ فِی عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِی عَوْنِ أَخِيهِ وَمَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَلْتَمِسُ فِيهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللّٰهُ لَهُ بِهِ طَرِيقًا اِلَی الْجَنَّةِ. وَمَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِی بَيْتٍ مِنْ بُيُوتِ اللّٰهِ يَتْلُونَ كِتَابَ اللّٰهِ وَيَتَدَارَسُونَهُ بَيْنَهُمْ اِلَّا نَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِينَةُ، وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ، وَحَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ، وَذَكَرَهُمُ اللّٰهُ فِيمَنْ عِنْدَهُ، وَمَنْ بَطَّأَ بِهِ عَمَلُهُ لَمْ يُسْرِعْ بِهِ نَسَبُهُ."

(رواہ مسلم بھذا اللفظ)

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "جس نے کسی مومن کی دنیاوی پریشانیوں میں سے کوئی پریشانی دُور کر دی، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کی پریشانیوں میں سے اس کی ایک پریشانی دُور فرما دیں گے اور جس نے کسی تنگ دست کے لیے آسانی پیدا کر دی، اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کی پردہ پوشی فرمائیں گے۔" فرمایا "اللہ تعالیٰ اس وقت تک بندے کی اعانت کرتے ہیں جب تک بندہ اپنے بھائی کی اعانت کرتا رہتا ہے

اور جو علم دین کی جستجو میں کسی راستہ پر چلا، اللہ تعالیٰ جنت کے راستہ کو اس کے لیے آسان کر دیں گے اور جو گروہ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہو کر کتاب اللہ کی تلاوت کرتا ہے اور ایک دوسرے کو اس کا درس دیتا ہے سو اللہ تبارک وتعالیٰ ایسے گروہ پر سکینت نازل کرتا ہے، رحمتِ حق ان پر سایہ فگن ہوتی ہے، فرشتے ان کو گھیر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے درباریوں میں ان کا تذکرہ کرتا ہے اور جس کا عمل اسے بلند مرتبہ تک پہنچانے میں تاخیر کرے اس کا نسب اسے بلند مرتبہ تک لے جانے میں جلدی نہیں کرتا۔''

تشریح:

یہ ایک جامع حدیث ہے جس میں علم کی فضیلت، آداب، مسلمانوں کی خدمت او ذکر کی فضیلت واہمیت بیان کی گئی ہے۔ آپ ﷺ کی جامع احادیث میں سے یہ ایک ہے۔ اس حدیث میں بیان کردہ کاموں اور ان کی فضیلتوں کو دیکھا جائے تو اسلام کی جامعیت سامنے آتی ہے۔ اسلام اپنی اصلاح اور ایک دوسرے کی اصلاح کی خاطر مل کر کتاب کی تلاوت اور اس میں غوروفکر کرنے، باہمی تعلیم دینے اور حسب ونسب پر فخر نہ کرنے اور عمل کرنے کا نام ہے۔

(۱) ''جس شخص نے کسی مومن.........اللہ تعالیٰ اس پر دنیا وآخرت میں آسانی کرے گا۔''

کسی مصیبت اور تکالیف میں مبتلا مسلمان کی مصیبت ہلکی کرنے اور اسے اس میں سے نکالنے کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں جیسے بھوکے کو کھانا کھلانا یا کسی استطاعت والے کو اس کی ترغیب دینا، کسی بے روزگار کو روزگار دلانا، کسی بیمار کو معالج کے پاس لے جانا اور دوا لے کر دینا، کسی کا ضامن بننا، کسی بھولے کو راہ دکھانا وغیرہ ایسی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں جو اس کام کی اہمیت کو محسوس کرنے پر سامنے آسکتی ہیں۔ قیامت کے دن جس طرح عبادتیں کام آئیں گی اسی طرح مجبور انسانوں کی خدمت بھی کام آئے گی اور تکلیفوں سے نجات کا سبب بنے گی۔

(۲) ''جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے......... پردہ پوشی فرمائیں گے۔''

مسلمانوں کی کوتاہی کی پردہ پوشی کرنا اسلامی معاشرے کی خاص صفت اور اللہ کے ہاں اجر وثواب کا باعث ہے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کے فرمان سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم

عاشرے میں بُرائی کا چرچا نہ ہو اور جتنا ہو سکے، اسے چھپایا جائے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ. (النور۲۴: ۱۹)

''جو لوگ چاہتے ہیں کہ مومنوں میں بُرائی پھیلے، ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے۔''

گناہوں اور عیوب کی دو بڑی قسمیں ہیں: ایک وہ گناہ اور بُرائیاں جن کا تعلق آدمی کی انفرادی زندگی سے ہے اور ان کا شر اور بُرائی معاشرے میں نہیں پھیلتی تو ایسے کاموں پر پردہ ڈالنا مستحب اور بہتر ہے اسی طرح کسی آدمی سے کوئی اتفاقی غلطی سرزد ہوئی ہے یا گناہ کا کام ہوا ہے اور بات رفع دفع ہو رہی ہے یا ہوگئی ہے تو اس کا چھپانا افضل ہے۔ دوسرے وہ گناہ جن کا تعلق اجتماعی زندگی اور معاشرے سے ہے اور ان بُرائیوں کا مرتکب عادی مجرم ہے تو ایسے جرائم اور مجرموں پر پردہ ڈالنا جائز نہیں ہے اگر ہو سکے تو مجرم کو وعظ ونصیحت کر کے سمجھایا جائے اور ذمہ داروں کے پاس بات پہنچائی جائے تاکہ وہ جرم کا سدباب کریں ورفساد کو بڑھنے سے روکیں اس طرح شاہدوں، راویوں کی کوتاہیوں اور اجتماعی مالیات میں غبن کرنے والے افراد کے غبن کو ظاہر کرنا چاہیے۔ ظالموں، دھوکہ بازوں اور بدمعاشوں پر پردہ ڈالنا گویا جرم کو بڑھانا اور نیکوں اور شریفوں پر ظلم کرنا ہے۔ شیخ سعدی نے کہا ہے ؎

نکوئی با بدان کردن چنانست
کہ بدکردن بجائے نیک مرداں

''بُرے لوگوں سے نیکی کرنا ایسا ہے جیسے نیک لوگوں کے ساتھ بُرائی کرنا۔''

مومن چونکہ دنیا میں اللہ کا سپاہی ہے اس لیے اپنی بساط کے مطابق بُرائی کو روکنے کی خود بھی کوشش کرے اور جس بات میں مسلمانوں کی مصلحت و بھلائی ہو تو ایسے حکام تک اس کی اطلاع بہم پہنچائے جہاں سے اس کا تدارک کیا جا سکتا ہو البتہ کسی کی عیب جوئی میں لگ جانا، کسی کو صرف خوار کرنا، اپنے نفس کی تسکین کی خاطر کسی کے عیب بیان کرنا، جس عیب کے فاش کرنے میں اجتماعی مصلحت نہ ہو تو ایسی تمام صورتوں میں عیب پر پردہ ڈالنا افضل اور بھلائی کا عمل ہے، ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ نے خوش خبری دی ہے کہ دنیا و آخرت میں اس کی

پردہ پوشی کرے گا۔

(۳) ''اللہ تعالیٰ اس وقت تک ایسے بندے..........مسلمان بھائی کی مدد میں ہوتا ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو ایسے انسان پیارے ہیں جو دوسروں کی مدد میں مصروف ہوتے ہیں۔ ایک روایت ہے کہ الخلق عیال اللہ یعنی مخلوق اللہ کی عیال ہے لہٰذا جو شخص کسی کے عیال سے بھلائی کرے تو اچھا لگتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اس کا بدلہ چکائے اور احسان اُتارنے کے لیے اس کی مدد کرے لہٰذا جو لوگ مجبور اور بے سہارا افراد کی مدد کرتے ہیں، وہ اللہ کے پیارے ہیں اور اللہ اپنے پیاروں کا مددگار ہوگا اس لیے مخلوقِ خدا کی جائز مدد دل کھول کر کرنی چاہیے اور اللہ سے ثواب واجر کی نیت رکھنی چاہیے۔

(۴) ''جو شخص ایسی راہ پر چلتا ہے..........بہشت کی راہ آسان کرے گا۔''

اس سے دین کا علم حاصل کرنے کی اہمیت اور فضیلت معلوم ہوتی ہے اسی طرح حصولِ علم کے لیے محنت کرنا، سفر کرنا اور اس کی راہ میں پیش آنے والی تکالیف برداشت کرنے کا درجہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ ذیل میں وہ شرائط دی جارہی ہیں جنہیں دین کا علم حاصل کرنے اور اس کے لیے سفر کرنے سے پہلے یہ پوری چاہئیں، دینی طالبِ علموں، اس کے لیے سفر کرنے والوں اور علماء کو انہیں ضرور مدنظر رکھنا چاہیے۔

(الف) اخلاص ونیت کی درستگی:

درحقیقت یہ شرط نیکی اور عبادت کی اساس ہے۔ دینی علم حاصل کرنے میں نیت خالص ہو کہ میرا مقصد اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے احکام معلوم کرنا اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کو سمجھنا اور اللہ کی رضا حاصل کرنا ہے، کوئی دنیاوی غرض، لالچ، طمع اور بڑا آدمی بننا اور مال ودولت کمانا نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''تم کہو کہ میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور مرنا اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔'' (الانعام ۶:۱۶۲)

(ب) تواضع وانکساری اختیار کرنا:

طالبِ علموں اور معلموں کو چاہیے کہ اپنے اندر تواضع، عجز اور انکساری اختیار کریں اور

تکبر و بڑائی سے دور رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں۔'' (الفرقان ۲۵:۶۳)

ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''اے ابوذر! اپنے نبی کی وصیت سنبھال کر رکھو کہ اللہ تمہیں اس سے نفع دے گا۔ اللہ کے لیے تواضع اختیار کرو کہ وہ تجھے قیامت کے دن بلندی سے نوازے گا۔ میرے نیک اور بدامتی سے ملو تو سلام کرو اور موٹے کپڑے پہنو اور اس میں اللہ کی رضا کے سوا کوئی دوسرا مقصد نہ ہو تاکہ تمہارے دل میں تکبر اور عصبیت جگہ نہ پائیں۔''

(ج) علم پر عمل کرنا:

جو علم حاصل ہو اور دین کی جو بات معلوم ہو اس پر عمل کر کے علم اور عمل میں یکسانیت پیدا کرنی چاہیے۔ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ روزِ قیامت جب تک بندے سے پانچ باتوں کا جواب نہیں لے گا اس وقت تک بندہ میدانِ حشر سے آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ ان میں سے ایک یہ سوال ہوگا کہ جو علم تو نے حاصل کیا اس کے مطابق عمل کیا ہے؟ (الترمذی)
عارفوں نے کہا ہے کہ علم بلاعمل ایسے ہے جیسے بغیر پھل کے درخت۔ غرضیکہ علم کے مطابق عمل ضروری ہے ورنہ اس علم کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بے عمل یہودی عالموں کے بارے میں فرمایا:

كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا. (الجمعۃ ۶۲:۵)

''ان کی مثال اس گدھے کی طرح ہے جو دفتر اُٹھائے ہوئے ہے۔''

کسی واعظ، معلم اور داعی کے وعظ، تعلیم اور دعوت کا اثر اس وقت ہوتا ہے جب وہ اس پر خود عامل ہو ورنہ اس کا اُلٹا اثر ہوتا ہے یعنی وہ لوگ دین، دین داروں اور ان کی باتوں سے بدظن ہو جاتے ہیں۔

(د) علم کو آگے پہنچانا:

آدمی جو علم حاصل کرے، اسے دوسروں تک پہنچائے، تعلیم دے اور اس کی اشاعت کرے کیونکہ دینی علم عالم کے پاس امانت ہے۔ سو دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے یہ

امانت دوسروں کے حوالے کردے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا:

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْآ اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ. (التوبہ ۹:۱۲۲)

''اور یہ کچھ ضروری نہ تھا کہ اہلِ ایمان سارے کے سارے نکل کھڑے ہوتے پھر ایسے کیوں نہ ہوا کہ ان کی آبادی کے ہر حصے میں سے کچھ لوگ نکل آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جا کر اپنے علاقے کے لوگوں کو خبردار کرتے۔''

حضرت انسؓ نے روایت کی کہ آپ ﷺ نے اپنے صحابہ سے پوچھا ''کیا میں تمہیں سب سے بڑا سخی بتاؤں؟'' انہوں نے عرض کیا ''جی ہاں، یارسول اللہ! ﷺ'' آپ ﷺ نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ سخیوں کا سخی ہے اور میں آدم کی اولاد میں بڑا سخی ہوں اور میرے بعد سب سے بڑا سخی وہ ہے جس نے علم پڑھا اور پھر اسے پھیلایا، یہ شخص قیامت کے دن تنہا اُمت بن کے اُٹھے گا۔''

(ہ) تکبر اور بے جا بحث سے پرہیز کرنا:

طالبِ علم اور عالم دونوں کو تکبر، غرور، بے جا بحثوں، مناظروں سے دُور رہنا چاہیے جو شخص اپنے علم کے زور پر اترائے، علماء سے بحثیں اور مناظرے کر کے ان پر اپنا رعب بٹھائے اور دنیاوی فائدے حاصل کرے، ایسے فرد کے لیے نبی ﷺ فرماتے ہیں:

''جس شخص نے چار مقاصد کے لیے علم حاصل کیا، وہ دوزخ میں جائے گا: علماء سے برابری کرے یا بے وقوفوں سے بحثیں کرے یا اس کے ذریعے مال کمائے یا لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے۔'' لہٰذا علم حاصل کرتے وقت نہ تو ایسی نیت رکھے اور نہ ہی عالم بننے کے بعد ایسا رویہ رکھے۔

(و) فی سبیل اللہ تعلیم دینا:

معلم کو چاہیے کہ ثواب کی نیت سے اللہ کے لیے تعلیم دے اور علم پہنچانے میں بخل نہ

کرے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قُلْ لَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا. (الانعام ۶:۹۰)

''آپ کہیے کہ تم سے اس (دین پہنچانے) پر کوئی اجر نہیں مانگتا۔''

معلم کوشش کرکے اپنا گزر بسر کسی اور ذریعے سے کرے اور دین کی تعلیم فی سبیل اللہ دے البتہ اگر کوئی شخص اپنا پورا وقت اس کام میں لگا رہا ہے تو ضرورت کے مطابق تنخواہ لینا جائز ہے۔

(ز) علم نہ ہو تو نہ کہنا:

علم کی کوئی بات معلوم نہ ہونے کی صورت میں ''مجھے اس کا علم نہیں ہے'' کہنے میں عار اور شرم محسوس نہ کرنا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اعلیٰ مرتبے اور مقام کے باوجود فرمایا ''جس سے سوال پوچھا جا رہا ہے، وہ پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا'' اور آپ ﷺ سے روح کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا ''لا ادری'' (میں نہیں جانتا) امام شافعیؒ نے کہا کہ ''اپنے شاگردوں کو ''نہیں'' کہنا بھی سکھاؤ۔''

(ح) علم کی اشاعت میں تکالیف برداشت کرنا:

علم کی باتیں کہنے، نصیحت کرنے، حق بات بتانے اور سلف صالحین کی اقتداء کرنے میں کوئی تکلیف پہنچے تو اسے برداشت کرنا چاہیے اور اس پر صبر کرنا چاہیے۔ نبی ﷺ نے فرمایا ''کسی نبی کو اتنی تکلیف نہیں دی گئی جتنی مجھے دی گئی ہے۔''

(ط) تعلیم دینے میں حاجت مند کو ترجیح دینا:

علم پڑھانے میں ضرورت اور شوق رکھنے والوں کو ترجیح دینا چاہیے جس طرح صدقہ اور خیرات کرتے وقت ضرورت مندوں کو پہلے دیا جاتا ہے اور حاجت مندوں کا زیادہ لحاظ رکھا جاتا ہے اسی طرح علم پڑھانے میں بھی لحاظ رکھا جائے۔

(ی) علماء کی خدمت کرنا:

علم حاصل کرنے میں علماء کی صحبت اختیار کرنا، ان کی خدمت کرنا، ان کی طرف سفر کر

کے جانا، ان کی عزت واحترام اور قدر کرنا ضروری باتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

''ان سے موسیٰ علیہ السلام نے کہا کیا میں آپ کی پیروی کروں تا کہ آپ اپنے علم وہدایت کی مجھے تعلیم دیں؟'' (الکہف ۱۸:۶۶)

تعلیم کی فضیلت:

(۵) ''جو گروہ اللہ کے گھروں .... ان کا تذکرہ کرتا ہے۔''

اس کے بعد علم وتعلیم کے حلقہ جات واجتماعات کی فضیلت بیان کی گئی ہے کہ جو لوگ مسجدوں میں جمع ہو کر اللہ کی کتاب پڑھیں، پڑھائیں، ایک دوسرے کو اس کی تعلیم دیں اور اس کے معانی ومفاہیم پر غور کریں، انہیں اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور فرشتوں کی دعائیں نصیب ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کا تذکرہ ایسی مجلس میں کرتے ہیں جو بہترین مجلس ہوتی ہے۔

(۶) حدیث زیر مطالعہ کے آخر میں اسلام کا ایک اہم اصول بیان کیا گیا ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں حسب ونسب اور ذات وپات کا کوئی وزن اور مقام ومرتبہ نہیں ہے، کسی کا اعلیٰ ذات اور اعلیٰ نسب ہونا آخرت میں نجات نہیں دلائے گا لیکن اعمالِ صالحہ نجات کا باعث ہوں گے جو شخص عمل میں پیچھے رہ گیا، وہ اپنی حسب ونسب کی وجہ سے آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ اللہ کے ہاں معیار فضیلت اخلاص، عمل اور کردار ہے۔

ارشادِ الٰہی ہے:

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللهِ اَتْقَاکُمْ. (الحجرات:۴۹:۱۳)

''بلاشبہ اللہ کے نزدیک عزت والا وہ ہے جو زیادہ تقویٰ والا ہے۔''

ایک حدیث میں ہے:

''اللہ تمہارا نسب اور مال نہیں دیکھتا لیکن تمہارے دل اور عمل دیکھتا ہے لہٰذا مومن ہمیشہ اپنے اعمال کی اصلاح کی تدبیر میں لگا رہے اور اپنی ذات پات اور حسب ونسب پر فخر وبڑائی نہ کرے۔''

حدیث نمبر 37

نیکی اور بدی کا ارادہ

عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِيمَا يَرْوِيهِ عَنْ رَبِّهِ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى قَالَ: "إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ، ثُمَّ بَيَّنَ ذٰلِكَ، فَمَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ عِنْدَهُ حَسَنَةً كَامِلَةً، وَإِنْ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ عِنْدَهُ عَشْرَ حَسَنَاتٍ إِلٰى سَبْعِمِائَةِ ضِعْفٍ إِلٰى أَضْعَافٍ كَثِيْرَةٍ وَإِنْ هَمَّ بِسَيِّئَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ عِنْدَهُ حَسَنَةً كَامِلَةً وَإِنْ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ سَيِّئَةً وَاحِدَةً" رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ فِيْ صَحِيْحِيْهِمَا بِهٰذِهِ الْحُرُوْفِ.

فَانْظُرْ يَا أَخِي وَفَّقَنَا اللّٰهُ وَإِيَّاكَ إِلٰى عَظِيْمِ لُطْفِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَتَأَمَّلْ هٰذِهِ الْأَلْفَاظَ، وَقَوْلُهُ "عِنْدَهُ" إِشَارَةٌ إِلٰى الْإِعْتِنَاءِ بِهَا وَقَوْلُهُ "كَامِلَةً" لِلتَّاكِيْدِ وَشِدَّةِ الْإِعْتِنَاءِ بِهَا، وَقَالَ فِي السَّيِّئَةِ الَّتِيْ هَمَّ بِهَا ثُمَّ تَرَكَهَا "كَتَبَهَا اللّٰهُ عِنْدَهُ حَسَنَةً كَامِلَةً" فَاَكَّدَهَا بِكَامِلَةٍ، "وَإِنْ عَمِلَهَا كَتَبَهَا وَاحِدَةً فَأَكَّدَ تَقْلِيْلَهَا بِوَاحِدَةٍ وَلَمْ يُؤَكِّدْهَا بِكَامِلَةٍ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ سُبْحَانَهُ لَا نُحْصِيْ ثَنَاءً عَلَيْهِ وَبِاللّٰهِ التَّوْفِيْقُ.

"حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ رب العزت والجلال سے براہِ راست روایت کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں "اللہ تعالیٰ نے نیکیوں اور بُرائیوں کو لکھ دیا ہے پھر اسے خوب بیان بھی کر دیا ہے لہٰذا جس

شخص نے نیکی کا ارادہ کیا اور پھر اس کو نہ کیا تو بھی اللہ تعالیٰ اپنے یہاں پوری ایک نیکی اس کے نامۂ اعمال میں لکھا دیتے ہیں اور جس نے نیکی کے ارادے کے ساتھ ساتھ وہ نیکی کر بھی لی تو اللہ تعالیٰ اپنے یہاں اس کے بدلہ میں دس سے لے کر سات سو تک بلکہ اس سے بھی زیادہ نیکیاں اس کے نامۂ اعمال میں لکھ دیتے ہیں اور اگر کسی نے بُرائی کا ارادہ کیا اور پھر اس کا ارتکاب نہ کیا تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلہ میں اپنے یہاں ایک نیکی لکھ دیتے ہیں اور اگر بُرائی کا ارادہ کر کے وہ بُرائی کر بھی لی تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلہ میں صرف ایک گناہ لکھ دیتے ہیں۔

(امام یحییٰ بن شرف الدین النووی (م ۶۷۶ء) اس حدیث کی مختصر تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں)

''میرے بھائی (ہمیں اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق دے) اللہ تعالیٰ کی مہربانی دیکھیے اور اس حدیث کے الفاظ پر تھوڑا سا غور کیجیے، اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ''اپنے پاس'' اس کا مطلب ہے رب تعالیٰ کا بندے کے ارادے کی طرف خاص توجہ کرنا اور اسے وزن دینا پھر لفظ ''پوری'' تاکید ہے اور اللہ تعالیٰ کا زیادہ توجہ کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کا ایسی بُرائی کے بارے میں فرمان جس کا بندے نے ارادہ کیا لیکن اسے عمل میں نہیں لایا، اللہ تعالیٰ اسے اپنے پاس پوری نیکی لکھتا ہے اس کی تاکید بھی ''پوری'' لفظ سے کی ہے اور اگر بُرائی کا عمل کیا تو اسے ایک بُرائی لکھتا ہے۔ اس میں بُرائی کی کمی اور ہلکا پن ایک کے لفظ سے بیان کیا اور اس کی تاکید لفظ کامل (پوری) سے نہیں کی۔ پس اللہ سبحانہ کی بے حساب تعریفیں اور بڑے احسانات ہیں، اللہ ہی توفیق دینے والا ہے۔''

تشریح:

حدیث کے شارحین نے لکھا ہے کہ یہ حدیث ان اہم اور عظیم احادیث میں سے ایک ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اس اُمت پر جو عظیم مہربانیاں اور احسانات کیے ہیں، ان کا بیان ہے۔ ان حضرات نے اس کی شرح میں کئی نکات اور تشریحات تحریر کی ہیں، ان میں سے

چند اختصار یے بیان کیے جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ارشاد فرمایا:

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ وَلاَ يُجْزٰى اِلاَّ مِثْلَهَا وَهُمْ لاَ يُظْلَمُوْنَ. (الانعام۵:۱۶۱)

''جس شخص نے نیکی کی تو وہ اس کے لیے اس کا دس گنا اجر ہے اور جس نے بُرائی کی تو اس جیسا ہی بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

دوسری جگہ ارشاد ہے:

''جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، ان کے خرچ کی مثال ایسے ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس میں سے سات بالیں نکالیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں اس طرح اللہ تعالیٰ جس کے عمل کو چاہتا ہے، بڑھاتا ہے۔''

(البقرہ۲:۲۶۲)

اسی طرح کی دوسری کتنی ہی آیتیں ہیں جنہیں عمل صالح اور انفاق کے بارے میں آمدہ احادیث سے ملایا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اللہ کے حضور میں اس کی رضا کے لیے اخلاص، سچائی اور ثواب کی نیت سے جو بھی نیکی کی جاتی ہے اس کا اجر کم از کم دس گنا ملتا ہے اور زیادہ کے لیے کوئی حد نہیں ہے۔ نیکی کی نوعیت، وقت، مقام اور نیکی کرنے والے کی کیفیت سے اس کا اجر کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔

حدیث کے عربی متن میں لفظ ہم (ارادہ) آیا ہے۔ علماء نے اس کیفیت کو سمجھنے کے لیے انسان کے دل میں آنے والے خیالات، تصورات اور ارادوں کی پانچ قسمیں بیان کی ہیں۔ دو شعروں پر غور کیجیے:

مراتب القصد خمس هاجس ذكروا
فخاطر بحديث النفس فاستمع
يليه هم فعزم كلها رفعت
سوى الاخير ففيه الاخذ قدوقع.

''قصد (ارادے) کے پانچ درجے ہیں: ہاجس (وہم یا ہلکا خیال) دل کا

خیال، دل کے وسوسے اور سوچ، ہم (ارادہ) اور عزم (پکا ارادہ) ان میں سے آخری کے سوا سب معاف ہیں۔''

نیکی کا ارادہ عزم کرتے ہی ایک نیکی لکھی جاتی ہے اور بُرائی کا ارادہ کرنے سے بُرائی نہیں لکھی جاتی اور جب کوئی ارادے کو عملی شکل دے تو بُرائی کرنے پر صرف ایک بُرائی لکھی جاتی ہے اور نیکی کرنے پر کم از کم دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ بزاز اپنی مسند میں ایک روایت لایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''اعمال کی سات قسمیں ہیں: دو عمل لازم کرنے والے ہیں، دو عمل ایسے ہیں جن میں ایک کے بدلے ایک ہے، ایک عمل ایسا ہے جس کے بدلے دس نیکیاں ہیں' ان میں میں ایک ایسا ہے جس پر سات سو نیکیاں ہیں اور ایک عمل ایسا ہے جس کا ثواب اللہ تعالیٰ کے پاس اتنا ہے کہ اسے شمار نہیں کیا جا سکتا' جو دو اعمال لازمی نتیجہ دینے والے ہیں وہ کفر اور ایمان ہیں جن کی وجہ سے دوزخ یا جنت لازم آئیں گے' جن دو اعمال کی وجہ سے ایک پر ایک ہے، وہ نیکی کا ارادہ کرنے پر ایک نیکی ہے اور بُرائی کرنے پر ایک بدی ہے۔ ایسا عمل جس کے بدلے دس نیکیاں ہی وہ مومن کا ہر نیک عمل جو صحیح نیت سے کیا جائے تو اس پر کم از کم دس نیکیاں ہیں' جو عمل سات سو کے برابر ہے، وہ مومن کا جہاد فی سبیل اللہ میں ایک درہم خرچ کرنا ہے اور ساتویں قسم روزہ ہے جیسے حدیث میں ہے ''مومن کا ہر عمل اس کے اجر والا ہے سوائے روزے کے جو میرے لیے ہے اور اس کا بدلہ میں خود دوں گا لہٰذا روزے کا اجر و ثواب اللہ ہی جانتا ہے۔''

بُرائی کا ارادہ کر کے چھوڑنے والوں کی تین قسمیں ہیں: ایک وہ شخص جو کسی بُرائی کا ارادہ کرتا ہے پھر اللہ کی خاطر اسے چھوڑ دیتا ہے یعنی ارادے پر عمل نہیں کرتا۔ ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ ایک نیکی کا اجر عطا کرتا ہے۔ یہ اس لیے کہ اس شخص نے ایک کام کرنے کا ارادہ کیا پھر اس کے خلاف عمل (دل کا عمل) کیا۔ ایک حدیث میں ہے:

انما ترکھا جرائی.

''اس نے میری وجہ سے یہ چھوڑی۔''

دوسرا وہ شخص جو بُرائی کرنے کے ارادے پر پختہ تھا لیکن بھول گیا اور غفلت کی وجہ سے یہ بُرائی نہ کر سکا سو اس کے لیے نہ نیکی ہے اور نہ ہی گناہ ہے۔

تیسرا وہ شخص جو بے بسی، سستی اور لاچاری کی وجہ سے بُرائی کے ارادے پر عمل نہیں کر سکا اگر چہ ارادے پر قائم تھا اس کے لیے کوئی نیکی نہیں ہے بلکہ اُلٹا ایک گناہ ہے کیونکہ وہ یہ بُرائی کرنے کی نیت رکھتا تھا بس اسے کسی وجہ سے موقع میسر نہیں آیا' جیسے ایک حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''جب دو مسلمان تلواریں (ہتھیار) لے کر آپس میں لڑیں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنمی ہیں۔'' صحابہ نے پوچھا ''یارسول اللہ! ﷺ اس قاتل کی تو بات سمجھ میں آتی ہے' البتہ مقتول کا دوزخی ہونا سمجھ میں نہیں آتا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا ''اپنے مدمقابل کے قتل کرنے پر حرص کرنے والا تھا۔'' یعنی اپنی نیت اور ارادے پر پختہ قائم تھا لیکن اسے قتل کا موقع نہیں ملا۔ دل کا ارادہ ایک قسم کا عمل ہے اس لیے دل کے عمل کا بھی ثواب اور اجر ہے۔

اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ مومنوں کو یہ بات ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ مومن کی سوچ تعمیری ہونی چاہیے اور اگر بُرائی کا منصوبہ اور خیال ذہن میں آ جائے تو اسے دُور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے اس کی رضا چاہتے ہوئے اس پر عمل نہ کرنے کا ارادہ و عزم کرنا چاہیے۔

حدیث نمبر 38

نوافل اور اللہ کی صحبت

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: إِنَّ اللهَ تَعَالٰی قَالَ: مَنْ عَادیٰ لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ آذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ، وَمَا تَقَرَّبَ إِلَیَّ عَبْدِی بِشَیْءٍ أَحَبَّ إِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُهُ عَلَیْهِ، وَلَایَزَالُ عَبْدِی یَتَقَرَّبُ إِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی أُحِبَّهُ، فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ کُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِی یَسْمَعُ بِهِ وَبَصَرَهُ الَّذِی یُبْصِرُ بِهِ وَیَدَهُ الَّتِی یَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِی یَمْشِی بِهَا وَلَئِنْ سَأَلَنِی لَأُعْطِیَنَّهُ، وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِی لَأُعِیْذَنَّهُ"

(رواہ البخاری)

"حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے جو شخص میرے کسی دوست سے دشمنی رکھے، میں اس سے اعلانِ جنگ کرتا ہوں اور میری پسندیدہ چیزوں میں سے کسی چیز سے میرا بندہ مجھ سے اس قدر قریب نہیں ہوتا جتنا ان چیزوں سے ہوتا ہے جو میں نے اس پر فرض کی ہیں اور میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ مجھے محبوب ہو جاتا ہے' پھر جب وہ میرا محبوب بن جاتا ہے تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے اور پھر جب وہ مجھ سے سوال کرتا

ہے تو میں اسے دیتا ہوں اور مجھ سے پناہ مانگتا ہے تو اسے پناہ دیتا ہوں۔''

تشریح:

اس حدیث میں دو اہم باتیں بیان ہوئی ہیں: ایک اللہ کے ولی سے عداوت رکھنا اور دوسری نوافل کی اہمیت اور ان کے فائدے۔ دونوں کا مختصر بیان کیا جاتا ہے۔

ولی

(۱) جس کے کہنے پر انسان چلے، اس کی ہدایات پر عمل کرے اور جس کے مقرر کردہ طریقوں، رسموں، رواجوں اور ضابطوں کی پیروی کرے۔

(۲) جس کی رہنمائی پر انسان بھروسہ کرے اور اسے اپنا ہادی رہبر سمجھے۔

(۳) جس کے بارے میں یہ عقیدہ رکھے کہ دنیا و آخرت میں مجھے بچانے والا ہے۔

(۴) جس کے بارے میں آدمی یہ سمجھے کہ دنیا میں غیبی طریقے سے میری مدد کر سکتا ہے، آفتوں اور مصیبتوں سے بچاتا ہے، رزق دیتا ہے، اولاد بخشتا ہے اور مرادیں اور حاجتیں پوری کرتا ہے۔

یہاں حدیث میں ولی کا لفظ مومن، مسلم اور تابع کے معنی میں آیا ہے۔ امام نوویؒ لکھتے ہیں:

المراد هنا بالولی المؤمن یعنی یہاں ولی سے مراد مومن ہے۔ علامہ ابن دقیق العید (م۷۰۲ھ) لکھتے ہیں:

وَلی اللهِ تَعَالٰی هُوَ الَّذِیْ یَتَّبِعُ مَا شَرَعَهُ اللهُ تَعَالٰی

''ولی اللہ وہ ہے جو اللہ کی شریعت کی اتباع اور پیروی کرے۔''

یعنی جو مسلمان اپنی پوری زندگی اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے احکام کے مطابق گزارے، وہی اللہ کا ولی اور دوست ہے اگرچہ ایسی زندگی گزارنا مشکل کام ہے۔

حاصل یہ کہ جس شخص کے انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام معاملات جیسے عقائد، عبادات، تہذیب و تمدن، معاشرت و معاملات، اخلاق و آداب و معیشت و تجارت وغیرہ اللہ اور رسول کے احکام کے مطابق ہوں تو وہ شخص ولی اللہ ہے، مسلم اور مطیع ہے۔

ولی سے دشمنی رکھنے کا مفہوم بزرگوں نے یہ بتایا کہ کوئی شخص ان کے دین وایمان کی وجہ سے ان کے حق بتانے اور حق پر چلنے کی بناء پر ان سے دشمنی رکھے تو اس کے لیے اللہ کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے تو اللہ جب چاہے، ایسے شخص کی گرفت کرے اور سزا دے۔ رہا سچے مسلمان سے عام باتوں میں اختلاف کرنا، مسائل پر بحث کرنا اور اختلافِ رائے رکھنا، یہ جائز ہے لیکن یہ کام اخلاص سے ہو اور دشمنی برائے دشمنی، مخالفت برائے مخالفت نہ ہو اور کسی دین دار اور صالح آدمی کو ذلیل کرنا نہ ہو۔

دوسری بات نوافل کی اہمیت اور ان کی ادائیگی پر حاصل ہونے والی نعمتوں اور رحمتوں کا بیان ہے۔ نبی ﷺ کے اس ارشاد سے واضح ہوا کہ فرض کا ادا کرنا نفل ادا کرنے سے افضل اور ضروری ہے لہٰذا جب تک انسان فرض ادا نہیں کرے گا اس وقت تک نفل کی ادائیگی فائدہ نہیں دے گی۔ اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے فرض ادا کرنا لازمی عمل ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے:

''فرض کا ثواب نفل کے ثواب پر ستر (۷۰) درجے زیادہ فضیلت رکھتا ہے''۔

کچھ لوگ فرضوں کی ادائیگی سے سستی اور غفلت برتتے ہیں اور نوافل اور مستحبات پر محنت کرتے ہیں' جبکہ فرض ادا کرنا اور محرمات وحرام سے بچنا اطاعت وعبادت کی بنیاد ہے' اس لیے بنیاد مضبوط کرنا ضروری ہے تاہم اس کے ساتھ نوافل ادا ہوتے رہیں تو سونے پر سہاگہ ہے۔

شریعت میں سنن، نوافل اور مستحبات کا ایک طویل اور بڑا سلسلہ ہے۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلسلے کسی نہ کسی فرض سے متعلق اور وابستہ ہیں۔ اسلام کی حکمتیں بیان کرنے والے عالموں نے ان کے کئی فائدے بیان کیے ہیں جو ان کی ادائیگی سے حاصل ہوتے ہیں۔ تاہم ان لاتعداد حکمتوں اور فائدوں میں سے چند ایک یہ ہیں.

(الف) سنتوں اور نفلوں کی ادائیگی سے جو عام طور پر کسی فرض سے منسلک ومتعلق ہوتے ہیں یا اس سے پہلے یا بعد میں ہوتے ہیں، انسان اس مطلوبہ فرض کی ادائیگی کے لیے جسمانی، ذہنی اور دلی طور پر تیار ہو جاتا ہے، ذہنی یکسوئی اور اس پر توجہ حاصل ہو جاتی ہے اور فرض ادا کرنے کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

ب) نوافل فرائض کی زیب وزینت اور ان کی سجاوٹ ہیں۔ اس کی ایک مثال امام نوویؒ نے اس طرح دی ہے ''کوئی آقا اپنے دو خادموں کو ایک ایک درہم کا پھل خرید کر لانے کا حکم دے، یہ دونوں خادم بازار جا کر پھل خرید کر لائیں، ان میں سے ایک خادم یہ پھل پلیٹ یا ٹرے میں رکھ کر، اس پر عرقِ گلاب یا کوئی اور خوشبودار عرق چھڑک کر اور اوپر رومال ڈھک کر خدمت میں ادب سے پیش کرے۔ دوسرا خادم فروٹ اپنی جھولی میں لے کر آئے اور آقا کے سامنے ڈال دے۔ ان دونوں خادموں میں سے پہلا خادم آقا کے پاس عزت پائے گا، پسندیدہ اور محبوب ہوگا اور اپنے آپ کو اچھا منوالے گا جبکہ دوسرا خادم بس تنخواہ کا حق دار بنے گا اور کوئی ترقی نہیں کر سکے گا۔

ج) فرائض میں جو کوتاہی اور کمی رہ جاتی ہے، نوافل اس کی تلافی کرتے ہیں اور پورا اجروثواب ملتا ہے۔

د) نوافل کا حقیقی فائدہ قیامت کے دن سامنے آئے گا۔ ایک روایت میں آیا ہے، حریث بن قبیصہ تابعی بیان کرتے ہیں کہ میں مدینے شریف آیا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی ''یااللہ! مجھے اپنے کسی صالح بندے کی صحبت عطا کر'' پھر میں ابوہریرہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور انہیں اپنی دعا کی بات بتائی اور عرض کی کہ ''مجھے کوئی ایسی حدیث سنائیں جو آپ نے خود نبی ﷺ سے سنی ہو شاید کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس سے نفع دے'' اس پر انہوں نے کہا ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے ''قیامت کے دن بندے کے اعمال میں سے سب سے پہلے نماز کا حساب ہوگا اور اس کی نماز کا جائزہ لیا جائے گا پھر اگر یہ درست نکلی تو بندہ کامیاب وکامران ہو کر نکلے گا اور اگر یہ خراب نکلی تو بندہ ناکام ونامراد ہوگا' پھر اگر اس کے فرضوں میں کمی نکلی تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا ''دیکھو میرے بندے کے اعمال میں کچھ نیکیاں (سنت ونفل) ہیں تاکہ اس کے فرضوں کی کمی پوری ہو سکے'' پھر باقی اعمال کا حساب بھی اسی طرح ہوگا۔

یہ ہے سنتوں اور نفلوں کا عظیم فائدہ اور نفع جو مومن کو مشکل وقت میں کام آئے گا۔

''پھر جب میں اس سے محبت کرتا ہوں.................. پناہ دیتا ہوں۔''

اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اسے اپنا بنا تا ہے اور اس کی خود حفاظت کرتا ہے اور اس کے اعضاء سے اپنی اطاعت وفرماں برداری کا کام لیتا ہے، پھر یہ بندہ اپنی نظر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں استعمال نہیں کرے گا بلکہ اس کے احکام کے مطابق دیکھے گا جس طرف بھی اس کی نظر جائے گی تو اللہ کی قدرت دیکھے گی۔

اس کی نظر غور وفکر اور عبرت کی ہوگی۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں ''میں جب بھی کوئی حسین وجمیل چیز دیکھتا ہوں تو اللہ تعالیٰ کو اس کے ساتھ دیکھتا ہوں، اس طرح دوسرے تمام اعضاء اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں اور نافرمانی میں ذرّہ برابر حرکت نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر اب اس کے کانوں کو قرآن مجید کی تلاوت' ذکر اللہ اور نیکی کی باتیں سننا پسند آئیں گی اور ناجائز آواز، راگ اور ساز سننا خراب لگے گا۔''

آخری کلمات پر غور کریں کہ جب یہ مانگے گا تو میں ضرور دوں گا جب بندہ اللہ کا پیارا بن جاتا ہے تو ہر ضرورت کے وقت اسے ہی پکارے گا اور اس میں کوئی حجاب اور جھجک محسوس نہیں کرے گا اور رب تعالیٰ بھی دینے میں دیر نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ایسے بندوں میں شامل کرے۔ (آمین)

حدیث نمبر 39

بھول چوک پر گرفت نہ ہونا

عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَلِيْ عَنْ أُمَّتِيْ الْخَطَأَ وَالنِّسْيَانَ وَمَا اسْتُكْرِهُوْا عَلَيْهِ" حَدِيْثٌ حَسَنٌ" رِوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَالْبَيْهَقِيُّ وَغَيْرُهُمَا.

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اللہ تبارک وتعالیٰ نے میری وجہ سے میری اُمت سے بھول چوک اور ان چیزوں کو جوان سے زبردستی کرائی جائیں، درگزر فرمادیا ہے۔''

تشریح:

اس اُمت پر جو اللہ تعالیٰ کی عنایتیں، رحمتیں اور سہولتیں ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے خطا (چوک) نسیان (بھول) اور زور جبر کی وجہ سے کیے ہوئے کام پر گرفت اور آخرت کی سزا معاف کردی ہے۔ قرآن مجید کی اس آیت میں اشارہ ہے:

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا. (البقرہ۲:۲۸۶)

''اے ہمارے پروردگار! اگر ہم سے بھول ہو جائے یا ہم سے خطا ہو جائے تو ہماری پکڑ نہ کر۔''

نبی ﷺ نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ نے تمہاری بھول اور خطا سے کیا ہوا عمل معاف کردیا ہے۔'' اگر اللہ تعالیٰ کی یہ مہربانی نہ ہوتی تو انسان مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے اور قدم قدم پر پریشانی اور تکلیف میں گرفتار ہوتا اور کتنے ہی اس کے عمل ضائع ہو جاتے۔

اب حدیث میں آمدہ چند اصطلاحات کی تشریح وتفصیل بیان کی جاتی ہیں اس تفصیل

میں جانے سے پہلے یہ بات سمجھ لیجیے کہ انسان سے تعلق رکھنے والے اعمال تین قسم کے ہیں

(۱) حقوق اللہ (۲) حقوق النفس (۳) حقوق العباد

بھول چوک اور زور جبر کی وجہ سے پہلی دو قسموں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت نہیں ہوگی اور بعض اعمال پر حکم بھی ساقط ہو جائے گا البتہ حقوق العباد میں کوتاہی اور بھول چوک (خطا) سے حق تلفی کرنے پر دنیا میں گرفت ہوگی تاہم آخرت میں معافی کی امید ہے جیسے خطا سے کسی مسلمان کو قتل کرنے پر دنیا میں فدیہ وکفارہ ہے اور بھول چوک سے کسی کا مال ضائع کرنے پر تاوان لازم آئے گا۔

خطا:

اس کام کو کہتے ہیں جو بلاارادہ اتفاق سے ہو جائے جیسے کوئی شخص روزہ رکھ کر وضو کرنے بیٹھا، کلی کرتے ہوئے بغیر ارادے کے پانی حلق میں چلا گیا۔

نسیان:

نسیان (بھول) کا مطلب یہ ہے کہ روزہ رکھ کر بھول گیا اور پانی پی لیا یا کھانا کھالیا۔

جبر:

جبر (زبردستی) مفہوم یہ ہے کہ کسی ظالم یا زورآور اور جابر کی طرف سے کوئی کام زبردستی شریعت کے خلاف کرانا، ان کاموں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی ہے اور گرفت نہیں ہوگی اور بعض اعمال پر حکم بھی ساقط ہو جائے گا جیسے روزے میں بھول سے کھانے پینے پر روزہ نہیں ٹوٹے گا' البتہ نماز پڑھنا بھول گیا تو جب یاد آئے، پڑھ لے اس طرح کوئی شخص جانور کو ذبح کرتے وقت بسم اللہ پڑھنا بھول گیا تو ذبیحہ حلال ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس اُمت سے خطا اور نسیان معاف کر دیئے ہیں۔

ایسا ہی حکم زور جبر کا ہے، کوئی ظالم کسی کو نماز پڑھنے سے روک دے یا کفر بکنے یا کسی کو گالی دینے پر مجبور کرے اور وہ مجبوراً اس طرح کرے تو گناہ گار نہیں ہوگا اور نہ ہی اس کے ایمان میں فرق آئے گا۔

اگر کوئی جابر کسی شخص کو کفر کا کلمہ (بول) کہنے پر مجبور کرے تو کہنے کی اجازت

(رخصت) ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ.

(النحل:١٦:١٠٦)

''جو شخص اللہ پر ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کرے لیکن وہ شخص نہیں جس سے زبردستی کی جائے اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو۔''

ایسے آدمی کی پکڑ نہیں ہوگی اور وہ مرتد اور گناہ گار نہیں ہوگا البتہ عزیمت (بڑی ہمت اور استقلال) کی راہ یہ ہے کہ زبان سے کفر کا کلمہ نہ کہے اور ایمان پر قائم رہے۔ یہ درجہ بہت اونچا اور اولوالعزم ہستیوں کا ہے۔ اسلامی تاریخ میں ایسے کتنے ہی مومن گزرے ہیں جنہوں نے موت قبول کی اور قتل ہو گئے لیکن کفر کا کلمہ زبان پر نہیں لائے۔ نسیان، خطا اور جبر کے مزید احکام اور ان کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں ملاحظہ کریں۔

حدیث نمبر 40

مومن اور دنیاوی زندگی

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: أَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِمَنْكِبِيْ فَقَالَ: ''كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيْبٌ أَوْعَابِرُ سَبِيْلٍ وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا يَقُوْلُ: إِذَا أَمْسَيْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الصَّبَاحَ، وَإِذَا أَصْبَحْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الْمَسَآءَ وَخُذْ مِنْ صِحَّتِكَ لِمَرَضِكَ وَمِنْ حَيَاتِكَ لِمَوْتِكَ.'' (رواہ البخاری)

''حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے میرے کندھے کو پکڑ کر فرمایا ''تم دنیا میں ایسے رہو جیسے پردیسی یا راہ گیر رہتا ہے۔''
حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرمایا کرتے تھے ''دنیا کو ایسی بے ثبات چیز سمجھو کہ جب شام ہو جائے تو صبح کا انتظار مت کرو اور جب صبح ہو جائے تو شام کا انتظار مت کرو اور تندرستی کے زمانے میں بیماری کے زمانے کے لیے عمل کر کے رکھ لو اور زندگی میں ہی موت کے لیے عمل کر کے رکھ لو۔''

تشریح:

اس حدیث میں نبی ﷺ نے مومن کی دنیا سے تعلق کی نوعیت اور کیفیت کو واضح فرمایا ہے۔ آپ ﷺ اور ابن عمرؓ کی نصیحت پر غور کرنے سے پہلے دنیا اور آخرت کے بارے میں اسلامی تصور کی وضاحت ضروری ہے تاکہ دنیا کی حقیقت سامنے آئے۔

اسلام کی نظر میں دنیا، کی زندگی عارضی اور وقتی چیز ہے اور آخرت دائمی اور ہمیشگی کی جگہ ہے، اس لیے دنیا کو دارالفناء اور آخرت کو دارالبقاء کہا گیا ہے۔ دنیا دارالعمل اور آخرت

دارالجزاء ہے، دنیا دل لگانے کا ٹھکانہ نہیں ہے بلکہ عارضی وطن ہے جبکہ آخرت اصلی وطن اور ہمیشہ رہنے کا گھر ہے' یہاں کی کامیابی اور ناکامی، دُکھ سکھ سب عارضی ہیں اور آخرت کے سکھ اور راحت یا عذاب دائمی ہیں۔

قرآن مجید میں دنیا اور دنیا کی زندگی کا نقشہ مختلف مقامات پر کچھ اس طرح کھینچا گیا ہے:

> ''دنیا کی زندگی میں چند دنوں کی بہار اور دھوکے کا سامان ہے، یہاں کا کھیل کود، یہاں کی دلچسپیاں اور رنگینیاں، رعنائیاں اور رونقیں، یہاں کے ٹھاٹھ باٹھ، ہار سنگار، یہاں کا فخر وغرور، یہاں کا دَھن ودولت، ساز وسامان جس میں لوگ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں، یہاں کی نوابیاں اور یہاں کی بادشاہیاں یہ سب فانی ہیں۔ یہاں کی رونقوں کی مثال ہری بھری فصل کی سی ہے جو چند دن بڑی لہلہاتی اور جھومتی ہے پھر خشک ہو کر ٹوٹ پھوٹ کر بھوسا بن کر اُڑ جاتی ہے۔''

دنیا کا یہ نقشہ اور کیفیت ہم روزانہ دیکھتے ہیں اور لوگوں کا اس دنیا کو چھوڑ کر خالی ہاتھ جانے کا منظر ہماری آنکھوں کے سامنے گزرتا ہے لیکن دنیا کی رنگینیوں میں ایسے محو ہوتے ہیں کہ اس سے عبرت نہیں پکڑتے۔

زیر مطالعہ حدیث میں اس دنیا سے مومن کا تعلق اور رویہ کیسا ہو، یہ بات سیدالمرسلینؐ نے دوسرے ملک میں جانے والے اجنبی شخص یا راہ رو مسافر کی مثال دے کر سمجھائی ہے جیسے ایک اجنبی اور مسافر آدمی اس علاقے اور ملک کی اشیاء، گھروں، لوگوں، مجلسوں اور محفلوں میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتا، ان کے دنگوں فسادوں میں شامل نہیں ہوتا اور نہ ہی لوگوں سے گہری دوستی رکھتا ہے کیونکہ اس کا اصلی اور حقیقی وطن دوسرا ہے جس کی اسے ہر وقت فکر لگی ہوئی ہے' اسی طرح ایک مسافر اپنے ساتھ اتنا ہی سامان لیتا ہے جتنا اسے واپس وطن پہنچنے تک چاہیے اور جس سے سفر میں تکلیف نہ اُٹھانی پڑے۔ اسی طرح وہ سفر میں مکان بنا کر مکین نہیں بن جاتا بلکہ جاری سفر میں تو کسی درخت کے سایہ تلے بیٹھ کر یا کسی سرائے میں ٹھہر کر تھوڑا سا آرام کر کے اپنے وطن کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔

حدیث نمبر 41

کامل مومن

عَنْ أَبِیْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رَضِیَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: "لَا یُؤْمِنُ أَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ" حَدِیْثٌ صَحِیْحٌ، رَوَیْنَاهُ فِیْ کِتَابِ الْحُجَّةِ بِإِسْنَادٍ صَحِیْحٍ.

"حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن عاص نے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوگا جب تک اس کی خواہش میرے لائے ہوئے طریقے کے تابع نہ ہو جائے۔"

تشریح:

نبی اکرم ﷺ کی جامع احادیث میں سے یہ حدیث بھی ہے، اس میں دین کی ایک ایسی اصولی بات کی گئی ہے جو دین کے چھوٹے بڑے تمام معاملات پر چسپاں ہوتی ہے۔

اس حدیث کو سورۂ احزاب ۳۳ میں آمدہ آیت ۳۶ سے ملا کر مطالعہ کیا جائے۔ ارشاد ہے:

مَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ یَّکُوْنَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ. (احزاب ۳۳:۳۶)

"کسی مومن مرد اور مومنہ عورت کو اللہ اور اس کے رسول کا ان کے کسی معاملے کا فیصلہ کرنے کے بعد انہیں (قبول کرنے یا نہ کرنے کا) اختیار نہیں ہے۔"

مطلب یہ کہ خدا کو معبود ماننے، رسول کو اپنا ہادی اور رہنما ماننے کے بعد مومن کا

طریقہ، ڈھنگ اور سوچ کا انداز یہ ہو کہ اس کے عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت، اخلاق و آداب اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے جو احکام اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی طرف سے دیئے گئے ہیں، وہی صحیح اور ضروری ہیں' پھر زندگی گزارنے میں جو بھی معاملات سامنے آئیں تو ان کا فیصلہ رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی ہدایت میں سے ہی حاصل کرے یعنی صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک، پیدائش سے موت تک، گھر سے بازار تک اور مسجد سے کچہری تک کوئی بھی معاملہ ہو، اس کے صحیح یا غلط، حق یا ناحق، حلال یا حرام اور جائز یا ناجائز ہونے کا فیصلہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ سے حاصل کرے اور اپنی خواہشات، برادری کی رسم ورواج اور وڈیروں، پیروں اور سرداروں کے احکام کو چھوڑ کر رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی ہدایت کی طرف رجوع کرے، ان کی ہدایت کو اوپر رکھے اور دوسروں کی باتوں کو نیچے رکھے۔ یہ ہے ایمان باللہ اور ایمان بالرسول کا تقاضا جو ہر مومن کو اختیار کرنا چاہیے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

> ''نہیں! (اے محمدؐ) تمہارے رب کی قسم! یہ اس وقت تک مومن ہو نہیں سکتے جب تک اپنے جھگڑوں میں تجھے فیصلہ کرنے والا نہ سمجھیں پھر آپ جو فیصلہ کریں اس کے لیے اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور پوری طرح قبول کرلیں۔'' (النساء۴: ۶۵)

یہ ہے مسلمان کے لیے قرآن کا حکم کہ وہ اپنے تمام معاملات میں نبی ﷺ کو فیصلہ کرنے والا مان کر، ان کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کرے۔ اس بات کو ایک حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

> ''حضرت عبادہ بن صامتؓ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے اس بات پر بیعت کی کہ آپ ﷺ کا فرمان سنیں گے، چاہے تنگی ہو یا فراخی اور ہمارا دل چاہے یا نہ چاہے۔''

چونکہ دینِ اسلام ایک مکمل دین ہے اور زندگی کے تمام معاملات میں رہنمائی کرتا ہے، ہدایات دیتا ہے اور واضح احکام دیتا ہے تو پھر ہم مسلمانوں کا یہ رویہ کیوں ہے کہ شادی برات، ختنے وعقیقے (چھٹی)، موت، فوت اور دوسرے معاشرتی معاملات کا ٹکراؤ ہو تو وہاں

پر شریعت کو پسِ پشت ڈال کر برادری کی رسموں کو اختیار کرتے ہیں۔ یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے بلکہ ایک عملی حقیقت ہے اس کی ایک مثال کسی خاندان میں ان کے کسی بزرگ اور بڑی عمر کے آدمی کے انتقال کرنے پر میراث کی تقسیم کے وقت دیکھی جا سکتی ہے۔ اس موقع پر اگر کوئی دین دار شخص کہے کہ برادر، میراث اس طریقے سے اور ان حصوں میں تقسیم کریں جو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے مقرر کیے ہوئے ہیں یعنی مردوں اور عورتوں کو حصے دو اور کسی وارث کو محروم نہ کرو تو کیا جواب ملے گا؟ جناب! ہماری برادری میں عورتوں کو میراث میں سے حصہ دینے کا رواج نہیں ہے۔ یہ شریعت کو پس پشت ڈالنے اور برادری کے رواج کو فوقیت دینے کی واضح مثال ہے، اسی طرح زندگی کے دوسرے معاملات ہیں جن میں مسلمان کہیں انگریزوں کے قانون اور طریقے کی پیروی کرتے ہیں تو کہیں ہندوؤں، بدھوں اور سکھوں کے طور طریقوں کو شریعت کے مقابلے میں اختیار کیے ہوئے بیٹھے ہیں، تو کہیں اپنی خواہشات کے پیچھے چل رہے ہیں تو کہیں باپ دادا کے جاہلی طریقوں کو اپنائے ہوئے ہیں۔ یہ تمام باتیں کامل مومن بننے کی راہ میں رکاوٹیں ہیں، ان تمام رکاوٹوں کو توڑ کر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ہدایت کی پیروی کی جائے گی تب ہی مسلمان کامل مومن ہوگا اور دنیا و آخرت کی کامیابی حاصل کرے گا۔

حدیث نمبر 42

توبہ واستغفار

عَنْ أَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: ”سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ: قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: یَا ابْنَ آدَمَ اِنَّکَ مَا دَعَوْتَنِیْ وَرَجَوْتَنِیْ غَفَرْتُ لَکَ عَلٰی مَا کَانَ مِنْکَ وَلاَ أُبَالِیْ، یَا أبنَ آدَمَ لَوْ بَلَغَتْ ذُنُوْبُکَ عَنَانَ السَّمَآءِ ثُمَّ اسْتَغْفَرْتَنِیْ غَفَرْتُ لَکَ، یَا أَبْنَ آدَمَ إِنَّکَ لَوْ أَتَیْتَنِیْ بِقُرَابِ الْأَرْضِ خَطَایَا ثُمَّ لَقِیْتَنِیْ لَاتُشْرِکُ بِیْ شَیْئًا لاَتَیْتُکَ بِقُرَابِھَا مَغْفِرَۃً." رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ.

”حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”اے ابن آدم! تم اگر مجھے پکارو اور مجھ سے امید رکھو تو میں تمہارے گناہ بخش دوں گا اور کوئی پرواہ نہیں ہے۔ اے ابن آدم! اگر تمہارے گناہ آسمان کے کناروں کو (کثرت میں) جا پہنچیں پھر تم مجھ سے بخشش چاہو تو میں تمہیں بخش دوں گا۔ اے ابن آدم! اگر تم میرے پاس زمین کے بھرنے جتنے گناہ لے کر آؤ اور مجھ سے اس حال میں ملو کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں کیا تو میں تجھے اتنی بخشش سے نوازوں گا کہ اس سے زمین بھر جائے۔“

تشریح:

اس حدیث مبارکہ میں ایک طرف اللہ تعالیٰ کے عظیم حلم وکرم، رحمت وشفقت اور فضل واحسان کا بیان ہے تو دوسری طرف بندے کے لیے مغفرت وعفو کی خوش خبری وبشارت

ہے۔ حدیث پر غور کرنے سے مومن کے دل سے ایسی مایوسی اور ناامیدی نکل جاتی ہے جس سے شریعت میں منع کیا گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ بندہ گناہوں کے انجام وعاقبت سے بےفکر اور بےخوف ہوکر گناہ کرنے پر کمر بستہ ہو جائے بلکہ اسے چاہیے کہ اس سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو فوراً اپنے رب کی طرف رجوع کرے اور اپنے گناہوں کی معافی طلب کرے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا. (النساء۴:۱۱۰)

"اور اگر کوئی شخص بُرا فعل کر گزرے یا اپنے نفس پر ظلم کر جائے اور اس کے بعد اللہ سے درگزر کی درخواست کرے تو اللہ کو درگزر کرنے والا اور رحم کرنے والا پائے گا۔"

استغفار اور توبہ دونوں ایک ساتھ ہوں یعنی اپنے گناہوں کی معافی بھی مانگے اور آئندہ کے لیے گناہ نہ کرنے کا ارادہ بھی کرے۔ ایک اور آیت میں ہے:

وَاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ. (ہود۱۱:۳)

"اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ تو وہ ایک مدت خاص تک تم کو اچھا سامانِ زندگی دے گا اور ہر فضل والے کو اس کا فضل عطا کرے گا۔"

اور ارشاد ہے:

وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ. (النور۲۴:۳۱)

"اور اللہ تعالیٰ کی طرف تم سب رجوع کرو، اے مومنو! تاکہ تم کامیابی سے ہمکنار ہو جاؤ۔"

مذکورہ بالا آیتیں اور دیگر متعدد آیتیں اور حدیثیں واضح کرتی ہیں کہ مومن کو وقتاً فوقتاً چھوٹی بڑی کوتاہی اور گناہ میں اپنے رب کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور اپنے گناہوں کی معافی طلب کرنا چاہیے۔

استغفار کرنا ہر مومن کے لیے لازمی ہے کیونکہ ہر شخص سے کوئی نہ کوئی کوتاہی اور خطا ہوتی رہتی ہے۔علماء نے استغفار کے تین درجے بیان کیے ہیں:

ایک درجہ گناہ گاروں کا ہے، اپنے گناہوں کی معافی کے لیے استغفار کرنا یہ درجہ خطا کاروں کی استغفار کہلاتا ہے۔

دوسرا درجہ اللہ کا شکر ادا کرنے میں کوتاہی کرنے کا ہے جو اولیاء اور علماء کا ہے۔

تیسرا درجہ شکر ادا کرنے کا ہے، یہ نبیوں اور رسولوں کا ہے۔

توبہ کرنے کے لیے تین بڑی شرطیں ہیں جن کا توبہ کرتے وقت ملحوظ رکھنا ضروری ہے: پہلی شرط توبہ کا ارادہ کرتے ہی گناہ کا کام چھوڑ دینا، دوم کیے ہوئے گناہ پر نادم اور پشیمان ہونا اور سوم دوبارہ گناہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرنا۔بعض بزرگوں نے تین باتیں اور بھی بیان کی ہیں:

(الف) کسی انسان کا توبہ کرنے والے کے ذمہ کوئی حق باقی ہے تو اسے ادا کرنا یا اس سے معافی چاہنا۔ اس طرح کسی کو ذہنی، جسمانی اور اخلاقی تکلیف دی ہے تو اس سے معافی مانگنا۔

(ب) جن فرائض کی ادائیگی سے غفلت برتی ہے تو وہ ادا کرنا یا ان کا کفارہ دینا جیسے فرض نمازیں، روزے اور حج وغیرہ۔

(ج) نفس اور جسم کو جس طرح گناہوں کے مزے چکھائے ہیں اسی طرح اسے اللہ کی فرماں برداری میں چلانا اور تکلیف دینا۔

بیان کردہ حدیث اور دیگر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ توبہ اور استغفار کرنے کے لیے کوئی حد مقرر نہیں ہے یعنی اتنی مرتبہ تو توبہ قبول ہوتی ہے اور اس کے بعد نہیں ہوگی جیسے عام لوگوں میں مشہور ہے کہ بس تین مرتبہ توبہ قبول ہوتی ہے اور اس کے بعد نہیں ہوتی ہے، یہ بات غلط ہے اور اسلام کے تصور اور عقیدے کے خلاف ہے۔ بندہ جب بھی اللہ کی طرف اخلاص و پشیمانی سے رجوع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ لبیک کہتے ہیں اور اس کی مغفرت فرماتے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ بندہ گناہ کرنے کے بعد جب معافی مانگنے کے لیے اللہ تعالیٰ

کی طرف رجوع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے کے لوٹنے پر اس شخص سے زیادہ خوشی ہوتی ہے جس نے اپنی اس اونٹنی کو پالیا ہو جس پر اس کے کھانے پینے کا سامان لدا ہوا تھا۔

( ) انسان کو چاہیے کہ بار بار توبہ واستغفار کرتا رہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

''لوگو! اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ کر توبہ کرو، میں اس سے روزانہ ایک سو مرتبہ توبہ واستغفار کرتا ہوں۔'' ( )